إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

اگست ۲۰۲۵ء

البرہان

لاہور

- پاکستان کے ۱۰۰ مقتدر علماء کا عمار ناصر کی گمراہی پر اتفاق
- مغربی فکر و تہذیب کی پیدا کردہ جدید ریاست نہ صرف غیر اسلامی ہے بلکہ اسے اسلامی بنایا بھی نہیں جا سکتا

مُدیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

تین رنگوں میں قرآن حکیم کا اُردو ترجمہ سیکھنے کا آسان اور مؤثر طریقہ

اُردو میں عربی ذخیرۂ الفاظ کی مدد سے۔ نہ عربی گرامر، نہ رٹّا

اسباق کی شکل میں: مشکل الفاظ کے معانی، مفہوم کا خلاصہ اور حاصل کردہ سبق

تدریس القرآن

مرتب: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

پہلے پارہ کا ترجمہ سیکھنے کے بعد سارے قرآن کا ترجمہ ۸۰ فیصد سمجھ آنے کی گارنٹی

پی ڈی ایف پڑھیے، کتاب حاصل کیجیے یا اس کے اسباق یوٹیوب پر دیکھیے

جب تک ہم اللہ کی کتاب (قرآن مجید) نہیں سمجھیں گے اس پر عمل کیسے کریں گے؟

اور جب تک ہم اس پر عمل نہیں کریں، دنیا و آخرت میں کامیاب کیسے ہوں گے؟

تدریس القرآن کی طباعت و اشاعت اور تعلیمی اداروں اور پبلک میں اس کی ترویج کی کوششوں میں ہمارا ہاتھ بٹائیے

تحریک رجوع الی القرآن

کیمپ آفس: 127 علی ٹاؤن، ٹھوکر نیاز بیگ، رائے ونڈ روڈ لاہور

0300-4107282 0336-1913636

Prof.Dr. Muhammad Amin Muhammad Amin

Soneri Bank: PK92SONE0000120000056341

یہ اسباق یوٹیوب پر بھی موجود ہیں:
Prof.Dr. Muhammad Amin

تدریس القرآن

مرتب: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

قرآن حکیم کا ترجمہ سیکھنے کے لیے

سبق: ۱۸

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ مَدَنِیَّۃٌ

اٰیاتھا ۲۸۶ رکوعاتھا ۴۰

آیت (۹۰-۹۶)

متن قرآن حکیم مع ترجمہ لفظی وبامحاورہ	قرآنی لفظ	اردو استعمال
بِئْسَمَا · اشْتَرَوْا · بِهٖٓ · اَنْفُسَهُمْ · اَنْ · يَّكْفُرُوْا · بِمَآ	اشْتَرَوْا	بیع وشراء، مشتری، ہوشیارباش
برا ہے جو · انہوں نے خریدا · بدلے اس کے · اپنی جانوں کو · کہ · وہ انکار کرتے ہیں · اس کا جو	اَنْفُسَهُمْ	نفس، انفس، تنفس
بری چیز ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا	يَكْفُرُوْا	کفر، کفار، تکفیر
اَنْزَلَ · اللّٰهُ · بَغْيًا · اَنْ · يُّنَزِّلَ · اللّٰهُ · مِنْ فَضْلِهٖ	بَغْيًا	باغی، بغاوت
اتارا · اللہ نے · سرکشی کرتے ہوئے · کہ · نازل کیا · اللہ نے · اپنا فضل	فَضْلِهٖ	فضل وکرم، فاضل، افضل
کہ انہوں نے سرکشی کرتے ہوئے اللہ کی نازل کردہ (کتاب) کا انکار کیا اور سرکشی کی	يُنَزِّلَ	نازل، نزول، نزلہ
عَلٰى مَنْ · يَّشَآءُ · مِنْ عِبَادِهٖ · فَبَآءُوْ · بِغَضَبٍ · عَلٰى غَضَبٍ	يَشَآءُ	ان شاء اللہ، ماشاء اللہ، مشیت
ان پر جو · اس نے چاہا · اپنے بندوں میں سے · پس انہوں نے کمایا · غضب · پر غضب	عِبَادِهٖ	عبد، عبادت، عبودیت، عابد
کہ (کیوں) اللہ نے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہا اپنا فضل کیا۔ یوں انہوں نے خود	بِغَضَبٍ	غضب وغصہ، مغضوب
وَلِلْكٰفِرِيْنَ · عَذَابٌ · مُّهِيْنٌ ۝۹۰ · وَاِذَا · قِيْلَ · لَهُمْ	مُهِيْنٌ	اہانت آمیز، توہین کرنا
اور کافروں کے لیے · عذاب ہوگا · توہین آمیز · جب کہا · جاتا ہے · ان سے	قِيْلَ	قول، اقوال، قیل وقال
کو اللہ کے عذاب کا مستحق بنالیا اور کافروں کے لیے ذلت آمیز عذاب ہوگا۔ جب ان سے کہا جاتا		
اٰمِنُوْا · بِمَآ · اَنْزَلَ · اللّٰهُ · قَالُوْا · نُؤْمِنُ · بِمَآ	قَالُوْا	قول واقرار، اقوال زرّیں
تم ایمان لاؤ · اس پر جو · اتاری ہے · اللہ نے · وہ کہتے ہیں · ہم ایمان رکھتے ہیں · اس پر جو	نُؤْمِنُ	ایمان، مؤمن، مؤمنات
ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتاری ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے		
اُنْزِلَ · عَلَيْنَا · وَيَكْفُرُوْنَ · بِمَا · وَرَآءَهٗ · وَهُوَ · الْحَقُّ	مُصَدِّقًا	تصدیق، مصدقہ ذرائع
اتاری گئی ہے · ہم پر · اور وہ انکار کرتے ہیں · اس کا جو · اس کے بعد ہے · حالانکہ وہ · حق ہے	وَيَكْفُرُوْنَ	کفر، کفار، تکفیر
اس کتاب پر جو ہم پر اتاری گئی ہے اور اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں حالانکہ یہ سچی کتاب ہے		
مُصَدِّقًا · لِّمَا · مَعَهُمْ · قُلْ · فَلِمَ · تَقْتُلُوْنَ · اَنْۢبِيَآءَ	قُلْ	قیل وقال، قول، اقوال
تصدیق کرتی ہے · اس کی جو · ان کے پاس ہے · کہو · پھر کیوں · تم نے قتل کیا · نبیوں	تَقْتُلُوْنَ	قتل، قتال، قاتل
اور جو (کتاب) ان کے پاس ہے وہ اس کی تصدیق کرتی ہے۔ تم ان سے کہو اگر تم		

متن قرآن حکیم مع ترجمہ لفظی و بامحاورہ	قرآنی لفظ	اردو استعمال
اللّٰهِ · مِنْ قَبْلُ · اِنْ · كُنْتُمْ · مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩١﴾ · وَلَقَدْ · جَآءَكُمْ	كُنْتُمْ	کن فیکون
اللہ کے · اس سے پہلے · اگر · تم تھے · مومن؟ · اور تحقیق · آیا تمہارے پاس	مُّؤْمِنِيْنَ	ایمان، مؤمن، مؤمنات
(سچے) مومن تھے تو تم نے پہلے انبیاء کو کیوں قتل کیا؟ اور تمہارے پاس موسیٰ کھلی		
مُّوْسٰى · بِالْبَيِّنٰتِ · ثُمَّ · اتَّخَذْتُمُ · الْعِجْلَ · مِنْۢ بَعْدِهٖ	بِالْبَيِّنٰتِ	بیان، بیانیہ، مبین، تبیین
موسیٰ · ساتھ کھلی نشانیوں کے · پھر · بنالیا تم نے · بچھڑے کو · (معبود) اس کے بعد	اتَّخَذْتُمُ	اخذ کرنا، ماخوذ، مؤاخذہ
نشانیاں (معجزات) لے کر آئے لیکن اس کے باوجود تم نے ظلم کرتے ہوئے		
وَاَنْتُمْ · ظٰلِمُوْنَ ﴿٩٢﴾ · وَاِذْ · اَخَذْنَا · مِيْثَاقَكُمْ · وَرَفَعْنَا	اَخَذْنَا	اخذ کرنا، ماخوذ، ماخذ
اور تم · ظالم تھے۔ · اور جب · لیا ہم نے · تم سے عہد · اور اٹھایا ہم نے	رَفَعْنَا	ارفع، رفیع، رفعت
بچھڑے کو (معبود) بنا لیا۔ اور جب ہم نے طور (پہاڑ) تمہارے اوپر اٹھا کر		
فَوْقَكُمُ · الطُّوْرَ ؕ · خُذُوْا · مَآ · اٰتَيْنٰكُمْ · بِقُوَّةٍ · وَّاسْمَعُوْا ؕ	الطُّوْرَ	کوہِ طور، طورِ سینا
تمہارے اوپر · طور · پکڑو · جو · دی ہم نے تمہیں · قوت سے · اور سنو	خُذُوْا	اخذ کرنا، ماخوذ، مؤاخذہ
تم سے عہد لیا کہ اس (کتاب) کو قوت سے پکڑو اور سنو (عمل کرو)۔ وہ کہنے لگے	اسْمَعُوْا	سماعت، سامعین، سامع
قَالُوْا · سَمِعْنَا · وَعَصَيْنَا ۗ · وَاُشْرِبُوْا · فِيْ قُلُوْبِهِمُ	سَمِعْنَا	سماعت، سامعین، سامع
وہ کہتے ہیں · سنا ہم نے · اور نافرمانی کی ہم نے · اور رچ بس گیا · ان کے دلوں میں	عَصَيْنَا	معصیت، معاصی، عاصی
ہم نے سنا لیکن ہم نافرمانی کریں گے اور ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں میں بچھڑے		
الْعِجْلَ · بِكُفْرِهِمْ ؕ · قُلْ · بِئْسَمَا · يَاْمُرُكُمْ · بِهٖٓ · اِيْمَانُكُمْ	اُشْرِبُوْا	شربت، مشروب، شراب
بچھڑا · بسبب ان کے کفر کے · تم کہہ دو · برا ہے جو · حکم دیتا ہے تمہیں · اس کا · ایمان تمہارا	يَاْمُرُكُمْ	امر، آمر، مامور، امیر
کی محبت رچ بس گئی۔ تم ان سے پوچھو کہ تم کیسے مؤمن ہو او رتمہارا کیسا ایمان ہے		
اِنْ · كُنْتُمْ · مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩٣﴾ · قُلْ · اِنْ كَانَتْ · لَكُمُ · الدَّارُ	الدَّارُ	دارفانی، دیارغیر، دارارقم
اگر · تم ہو · مومن · تم ان سے کہو · اگر ہے · تمہارے لیے · گھر	مُّؤْمِنِيْنَ	ایمان، مؤمن، مؤمنات
جو تمہیں برائی سکھاتا ہے؟ تم ان سے کہو کہ اگر آخرت خالصتاً		
الْاٰخِرَةُ · عِنْدَ اللّٰهِ · خَالِصَةً · مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ · فَتَمَنَّوُا	خَالِصَةً	خالص، اخلاص، مخلص
آخرت کا · اللہ کے پاس · خالصتاً · سوائے دوسرے لوگوں کے · تو تم تمنا کرو	فَتَمَنَّوُا	تمنا کرنا، متمنی ہونا
تمہارے لیے ہے دوسروں کے لئے نہیں تو اس میں اگر تم مومن ہو تو تمنا کرو		(جاری ہے)

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۹ — شمارہ ۸

Since 2010

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk

اگست ۲۰۲۵ء/صفر المظفر ۱۴۴۷ھ

آئینہ مضامین

☜ تفہیم دین

-عمار ناصر کی گمراہی پر پاکستان کے ۱۰۰ مقتدر علماء کا اتفاق — مدیر — ۴

- عمار ناصر کی شہادت حسینؓ کے بارے میں ہرزہ سرائی — آصف محمود — ۱۳

-دینی جماعتوں کے مناہج میں اختلاف — مدیر — ۱۶

☜ شذرات

-قانونِ توہینِ رسالت پر نیا حملہ — غزہ کب تک تڑپتا رہے گا؟ — ۱۷

- مسلم اُمّہ: یہ انتشار اور بے حمیتی کب تک؟ — مدیر — ۱۹

- بین المسالک اہم آہنگی: وقت کی اہم ضرورت — ۲۰

☜ مقالۂ خصوصی: ریاست کی ماہیت — صابر علی — ۲۱

☜ تعلیم و تربیت

-اسلام کی جنسی تعلیمات برائے طالبات نہم و دہم — مدیر — ۴۶

-مقابلے (CSS) کے موجودہ امتحانات ختم کر دیئے جائیں — ادارہ — ۴۸

- پاکستانی یونیورسٹیوں میں تحقیق کا المیہ — ڈاکٹر محمد ارشد — ۴۹

-علماء اور ائمہ مساجد کی تنخواہیں کم کیوں؟ — حافظ محمد عمران طحاوی — ۵۰

☜ تزکیۂ نفس: قتیلِ محبت — ادارہ — ۵۵

☜ میڈیا: سوشل میڈیا سے اَن سوشل ہوتے لوگ؟ — حافظ محمد عمران طحاوی — ۵۷

☜ تفہیم مغرب: امریکہ زوال کی راہ پر — Stephan Richter — ۵۹

-مغربی تہذیب کے پیدا کردہ چیلنجز — ڈاکٹر سلمان آصف صدیقی — ۶۵

☜ عالم اسلام

- عالم اسلام میں مؤثر اسلامی جدوجہد کی تاریخ — حامد کمال الدین — ۷۰

-مسجد اقصیٰ کی تباہی کا خدشہ — پروفیسر ندیم غفور — ۷۵

- غزہ: شکوہ بحضورِ حق — ڈاکٹر مسعود ابن نظر — ۷۶

☜ تبصرۂ کتب

ماہنامہ صفدر لاہور (عمار ناصر نمبر) — مدیر — ۷۸

رہنمائے ملت اسلامیہ از میر افسر امان — ۷۹

English Section — Aadil Farook — ۸۲

Human Nature: Islam & the Harsh Realities of the World

مدیر

ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر

محمد یحییٰ رشید، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن

(0300-4107282)

[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے

سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے

تاحیات 20,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور

PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ

136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف

0306-4640366

تفہیم دین

مدیر

تجدد شرعاً نا قابلِ قبول ہے

عمار ناصر کی گمراہی پر پاکستان کے ۱۰۰ مقتدر علماء کا اتفاق

عمار ناصر کی گمراہی غامدی کی گمراہی سے زیادہ خطرناک ہے

ہماری طرف سے ایک وضاحت

* ہمیں عمار ناصر صاحب (بلکہ غامدی صاحب سے بھی) کوئی ذاتی اختلاف نہیں، ان سے اختلاف علمی وفکری ہے۔ بلاشبہ وہ ہمارے دیرینہ رفیق اور دوست (بلکہ ملی مجلس شرعی میں ہمارے صدر محترم) مولانا زاہد الراشدی صاحب کے صاحبزدے ہیں لیکن مولانا تو خود علمی اختلاف کے قائل بلکہ اس کے علمبردار ہیں، اس لیے علمی اختلاف تو کسی سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اُمید ہے مولانا زاہد الراشدی صاحب اس تحریر پر ہم سے ناراض نہ ہوں گے اور نہ انہیں ناراض ہونا چاہیے۔

* علمی اختلاف اور گمراہی میں فرق ہوتا ہے۔ علمی اختلاف کی ایک حد ہوتی ہے مثلاً اگر ہم کہیں کہ ہمیں غلام احمد قادیانی سے یا غلام احمد پرویز سے علمی اختلاف ہے تو یہ غیر مناسب بلکہ غلط اسلوب ہوگا کیونکہ جمہور امت اور علماء ان دونوں کے کفر پر متفق ہو چکے ہیں لہٰذا ہمیں ان کی مذمت کرنے میں کوئی باک نہیں۔ اسی طرح جمہور امت اور جمہور علماء غامدی کی گمراہی پر متفق ہو چکے ہیں (اور بہت سوں نے ان کی تکفیر بھی کی ہے)۔ اسی طرح عمار ناصر چونکہ پاکستان میں غامدی صاحب کے نمائندے (بلکہ نائب اور خلیفہ اوّل ہیں) اور ان کے شاگرد اور ساتھی ہیں (جس کا علی الاعلان وہ اقرار کرتے ہیں) تو ان کی گمراہی میں بھی کوئی شک نہیں۔ اور اب پاکستان کے ۱۰۰ مقتدر علماء کرام نے ان کو گمراہ قرار دے کر غامدی صاحب کے ساتھ ان کی گمراہی پر بھی مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ لہٰذا عمار ناصر کی اسی طرح مخالفت ومذمت کی جانی چاہیے جس طرح علماء کرام اور ہم جاوید غامدی کی کرتے رہے ہیں۔

* یاد رکھیے کہ عمار ناصر کی گمراہی جاوید غامدی کی گمراہی سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ

غامدی صاحب کی پاکستان میں کوئی ٹھوس علمی بنیاد اور حیثیت نہیں۔ وہ گورنمنٹ کالج سے بی اے آنرز ہیں۔ نہ درسِ نظامی پاس ہیں، نہ پاکستان کے دینی و علمی حلقوں میں ان کو رسوخ حاصل ہے۔ ان کو اچھا اسلامی سکالر سمجھنے والے صرف وہ لوگ ہیں جو مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب اور اس کے دلدادہ ہیں۔ یہ بھی سب سمجھتے ہیں کہ ان کو امریکہ (ومغرب) کی پشت پناہی حاصل ہے جبکہ اس کے مقابلے میں عمار ناصر صاحب پاکستان کے ایک مقتدر دینی و علمی (دیوبندی) گھرانے کے فرد ہیں۔ ان کے دادا جان مولانا سرفراز خاں صفدر مرحوم کو دیوبندی حلقہ ''امام اہل سنت'' کہتا ہے۔ ان کے بیٹے اور پوتے سب علمی حلقوں میں معروف ہیں لہٰذا عمار ناصر کی جڑیں پاکستان کے دیوبندی دینی حلقے میں بہت مضبوط ہیں اور ماہنامہ الشریعہ، شریعہ اکیڈمی کے تعلیمی پروگراموں اور مدرسہ ڈسکورسز کے ذریعے وہ دیوبندی دینی مدارس کے بہت سے نوجوانوں کو گمراہ کر چکا ہے۔ الحمدللہ! مولانا سرفراز صفدر مرحوم کے سارے بیٹے اور پوتے اور بھائی کے بیٹے سب (ماسوا مولانا زاہد الراشدی) عمار ناصر اور غامدی کے تجدد کے مخالف ہیں اور اسے گمراہی سمجھتے ہیں۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب سے علماء کو یہی گلا ہے کہ وہ عمار ناصر کی تائید و حمایت کیوں کرتے ہیں (صلبی بیٹا ہونا اس کی دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ بیٹا تو حضرت نوحؑ کا بھی تھا لیکن اس کی گمراہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمہارا بیٹا ہی نہیں چنانچہ حضرت نوحؑ نے فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی)۔ طویل برسوں تک عمار ان کے رسالے اور ادارے کے ذریعے گمراہی پھیلاتا رہا ہے اور آج بھی پھیلا رہا ہے کیونکہ اسی کے ساتھی اور تیار کردہ لوگ ماہنامہ الشریعہ و شریعہ اکیڈمی میں بیٹھے ہیں اور کام کر رہے ہیں بلکہ وہ خود ابھی تک الشریعہ کے مشاورتی بورڈ میں باقاعدہ شامل ہے۔ فالي الله المشتکی۔

* ہم عام طور پر موضوعات کو زیر بحث لاتے ہیں، افراد کو نہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیے کہ جب ہم شروع میں غامدی صاحب پر نقد کرتے تھے تو اس کا عنوان ہوتا تھا ''تجدد نا قابل قبول ہے'' لیکن جب جمہور اُمت اور جمہور علماء کسی شخص کے کفر یا اس کی گمراہی پر متفق ہو جائیں تو پھر اس کو بحیثیت فرد زیر بحث لانا مجبوری بن جاتا ہے کیونکہ وہ منبعِ زیغ و ضلال ہوتا ہے۔ اس

لیے اب ہم بھی مجبور ہیں کہ غامدی اور عمار ناصر کا نام لے کر ان کی گمراہی کی مذمت کریں تا کہ سادہ لوح مسلمان ان کی گمراہی پھیلانے کے حربوں سے متاثر نہ ہوں اور ان کے جال میں نہ پھنسیں۔

* ہم مولانا سرفراز خاں صفدر مرحوم کے پوتوں مولانا احسن خدامی اور مولانا حمزہ احسانی کے شکر گزار ہیں جنہوں نے عمار ناصر کی گمراہی کے سلسلے میں علماء کرام کی آراء جمع کیں اور انہیں افادۂ عام کے لیے ماہنامہ 'صفدر' میں خصوصی نمبر کے طور پر شائع کر دیا۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

عمار ناصر کے بارے میں ممتاز علماء کرام کی آراء

۱۔ ''یہ ناصر کس طرف چل نکلا ہے؟ تم اسے روکتے کیوں نہیں؟ اس کو سختی سے روکو۔'' (مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ)

۲۔ ''عمار خان ناصر غامدی کا شاگرد، ترجمان اور باطل نظریات کا حامی و ناشر ہے۔'' (مولانا سلیم اللہ خانؒ)

۳۔ ''عمار خان کی متنازع تحریرات نے فکری انتشار اور تفریق امت کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دی۔'' (مولانا مفتی محمد تقی عثمانی)

۴۔ ''آزاد غور و فکر کے نام پر اپنے استاذ جاوید غامدی کا حق نمک ادا کر رہے ہیں۔'' (مولانا ڈاکٹر مفتی عبد الواحدؒ)

۵۔ ''عمار خان ناصر کا مؤقف عقیدہ ختم نبوت اور آئین پاکستان کے منافی ہے۔'' (مولانا ڈاکٹر سعید احمد عنایت اللہ)

۶۔ ''مولانا عمار ناصر جب کبھی بات کرتے ہیں، قادیانیوں کے مفاد کی کرتے ہیں۔'' (مولانا اللہ وسایا)

۷۔ ''عمار ناصر غامدی کی تقلید میں اہل سنت کی راہ سے ہٹ کر گمراہی میں پھنس چکے ہیں۔'' (مولانا ابو احمد نور محمد قادری تونسویؒ)

۸۔ ''جو لوگ قادیانیوں کو یہ حقوق دلوانا چاہتے ہیں وہ 'مدعی سست گواہ چست' کا کردار ادا کر رہے ہیں۔'' (مولانا منیر احمد منور)

۹۔ ''عمار خان ناصر نے غامدی نظریات سے متاثر ہو کر علیحدہ فکری و نظریاتی راہ اختیار کر لی۔'' (مولانا عبدالقدوس قارن)

۱۰۔ ''اس وقت اُس کی حیثیت جاوید احمد غامدی کے وکیل کی ہے۔'' (مولانا عبدالحق خان بشیر)

۱۱۔ ''عمار کی کاوشوں سے ملحدوں اور قادیانیوں کو تقویت ملتی بلکہ ان کی ترجمانی ہوتی ہے۔'' (مولانا عبدالقیوم حقانی)

۱۲۔ ''عمار خان غامدی کا تنخواہ دار ملازم ہے۔ دین کے اندر اپنی تحریفات میں رواں دواں ہے۔'' (مولانا حبیب الرحمٰن سومرو)

۱۳۔ ''پاکستان میں اسرائیلی دانشور موشے زلمان کے ہم نوا جناب عمار خان ناصر ہیں۔'' (مولانا مفتی ابولبابہ شاہ منصور)

۱۴۔ ''غامدی فتنہ کے نظریات کی نمائندگی کرنے والے ایک صاحب ہکا بکا رہ گئے۔'' (مولانا مفتی محمد حسن)

۱۵۔ ''عمار نے اپنا راستہ قادیانیت کی سہولت کاری والا راستہ اختیار کیا ہے۔'' (مولانا ڈاکٹر محمد الیاس فیصل)

۱۶۔ ''عدالت میں قادیانیوں کی طرف داری کی کوشش کر کے اس نے اپنا ایمان خراب کیا۔'' (مولانا امداد اللہ انور)

۱۷۔ ''ان کا نسبی رشتہ حضرت امام اہل سنتؒ سے جبکہ فکری شجرہ ''غامدی'' سے جڑا ہوا ہے۔'' (مولانا مسعود ازہر)

۱۸۔ ''کشتی نوح سے اُتر جانے والے فرد کو ہمارا ترجمان یا امام اہل سنت کی لسان نہ سمجھا جائے۔'' (مولانا مفتی محمد طیب)

۱۹۔ ''عمار خان ناصر قادیانیوں کی حمایت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔'' (مولانا مفتی جمیل الرحمٰن)

۲۰۔ ''عمار خان کی مسلّمات اہل سنت کا دائرہ پار کرنے کی داستان طویل ہے۔(مولانا مفتی شعیب احمد)

۲۱۔ ''عمار خان ناصر کا معاملہ نوحؑ کے کافر بیٹے والا ہے۔'' (مولانا محمود الرشید حدوٹی)

۲۲۔ ''عمار خان ناصر غامدی صاحب کا فکری ترجمان بلکہ جانشین ہے۔'' (مولانا محمد ابو ایوب حنفی قادری)

۲۳۔ ''امتناعِ قادیانیت آرڈیننس کو غیر مؤثر بنانے کے لیے پہلی آواز عمار خان ناصر لگا چکا ہے۔'' (مولانا منیر احمد علوی)

۲۴۔ ''اس پر تجدیدِ ایمان و نکاح ضروری ہے۔'' (فتویٰ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی)

۲۵۔ ''مرزا اور اس کے پیروکاروں کو مسلمان سمجھنے والا شخص خود مرتد ہے۔'' (فتویٰ دار العلوم مدنیہ بہاولپور)

۲۶۔ ''اس پر تجدیدِ ایمان و نکاح اور علانیہ برأت شرعاً ضروری ہے۔'' (فتویٰ جامعہ خیر المدارس ملتان)

۲۷۔ ''عمار خان ناصر کے نظریات قرآن و سنت اور اجماع امت کے خلاف ہیں۔'' (فتویٰ مدرسہ اصحابِ صفہ لاہور)

علماء کرام جنہوں نے عمار ناصر کی گمراہی پر صاد کیا

۱۔ امام اہل سنت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ

۲۔ مولانا عبد القدوس خان قارن بن مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ

۳۔ مولانا عبد الحق خان بشیر بن مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ

۴۔ مولانا محمد فیاض خان سواتی بن مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ

۵۔ مولانا احسن خدامی بن مولانا عبد الحق خان بشیر

۶۔ حافظ شمس الدین خان طلحہ بن مولانا عبد القدوس خان قارن

۷۔ حمزہ احسانی بن مولانا عبد الحق خان بشیر

۸۔ محقق اہل سنت مولانا محمد نافع رحمہ اللہ [فاضل : دارالعلوم دیوبند]
۹۔ رئیس المحدثین مولانا سلیم اللہ خانؒ [صدر: وفاق المدارس العربیہ]
۱۰۔ شیخ التفسیر والحدیث مولانا منظور احمد نعمانی [جامعہ احیاء العلوم، ظاہر پیر، رحیم یار خان]
۱۱۔ شیخ الحدیث مولانا فضل الرحمٰن دھرم کوٹیؒ [جامعہ مدینۃ العلم، بہاولپور]
۱۲۔ شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد تقی عثمانی [صدر: جامعہ دارالعلوم کراچی]
۱۳۔ مولانا مفتی عبداللہ [رئیس دارالافتاء: جامعہ خیر المدارس، ملتان]
۱۴۔ مولانا مفتی شیر محمد علوی [مفتی: جامعہ اشرفیہ، لاہور، رئیس: دارالافتاء جمیلی، لاہور]
۱۵۔ مولانا مفتی ابوبکر سعید الرحمٰن [رئیس دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاؤن کراچی]
۱۶۔ مولانا مفتی محمد شفیق عارف [دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاؤن کراچی]
۱۷۔ مولانا اللہ وسایا [مرکزی رہنما: عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت]
۱۸۔ مولانا ناصر الدین خاکوانی [امیر مرکزیہ: عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت]
۱۹۔ مولانا مفتی محمد طیب عارفی [مدیر: جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد]
۲۰۔ مولانا مفتی عبدالغنی [جامعہ محمودیہ، جھنگ]
۲۱۔ مولانا مفتی محمد خاں قادریؒ [مدیر جامعہ اسلامیہ، لاہور]
۲۲۔ مولانا محمد نواز سیال رحمہ اللہ [بانی و شیخ الحدیث: جامعہ قادریہ حنفیہ، ملتان]
۲۳۔ مولانا عبدالرحیم [شیخ الحدیث، جامعہ محمدیہ، جھنگ]
۲۴۔ مولانا مفتی حامد حسن [مہتمم و شیخ الحدیث: دارلعلوم کبیر والا]
۲۵۔ مولانا مفتی محمد اویس ارشاد [نائب مہتمم: دارالعلوم کبیر والا]
۲۶۔ مولانا محمد طاہر مسعود [مدیر و شیخ الحدیث: جامعہ مفتاح العلوم، سرگودھا]
۲۷۔ مولانا مفتی محمد آصف علی [مفتی: جامعہ عمر بن خطاب، ملتان]
۲۸۔ مولانا مفتی محمد رمضان [صدر مفتی و مدرس: جامعۃ العلوم الشرعیہ، جھنگ]
۲۹۔ مولانا مفتی ریاض احمد [دارالافتاء: جامعہ مدینۃ العلوم، جھنگ]
۳۰۔ مولانا مفتی حبیب اللہ [رئیس دارالافتاء: مدرسہ مدینۃ العلوم، سرگودھا]
۳۱۔ مولانا قاری عبدالحمید حامد [مدیر: جامعہ انوار القرآن، مسئول وفاق المدارس: ضلع

چنیوٹ]

۳۲۔ مولانا مفتی محمد بلال [دارالافتاء: مدرسہ فتح العلوم، چنیوٹ]

۳۳۔ مولانا سیف اللہ خالد [ناظم: جامعہ اسلامیہ امدادیہ، چنیوٹ]

۳۴۔ مولانا مفتی محمد صدیق [دارالافتاء: دارالعلوم، فیصل آباد]

۳۵۔ مولانا محمد ادریس [ناظم: دارالعلوم، فیصل آباد]

۳۶۔ تلمیذ امام اہل سنت مولانا محمد نواز بلوچ [مدیر: مدرسہ ریحان المدارس، گوجرانوالہ]

۳۷۔ مولانا مفتی محمد حذیفہ [دارالافتاء جامعہ امداد العلوم اسلامیہ، پشاور]

۳۸۔ مولانا مفتی عبدالرحمٰن [استاذ حدیث ومفتی: جامعہ اسلامیہ، ومسئول وفاق: راولپنڈی]

۳۹۔ مولانا محمد ایوب خان ثاقب [مہتمم: دارلعلوم مدینہ ڈسکہ]

۴۰۔ مولانا حافظ محمد اسحاق [شیخ الحدیث: دارلعلوم مدینہ ڈسکہ]

۴۱۔ مولانا مفتی عبدالقدوس [جامعہ اسلامیہ ڈسکہ سیالکوٹ]

۴۲۔ مولانا مفتی محمد مکرم الدین حسامی قاسمی [استاذ فقہ وحدیث: دارالعلوم حیدرآباد الہند]

۴۳۔ مولانا نور محمد تونسوی رحمہ اللہ [مدیر: جامعہ عثمانیہ، ترنڈہ محمد پناہ، رحیم یارخان]

۴۴۔ مولانا منیر احمد منور [صدر مدرس وشیخ الحدیث: جامعہ اسلامیہ باب العلوم، کہروڑ پکا]

۴۵۔ مولانا مفتی محمد حسن [شیخ الحدیث: جامعہ محمدیہ چوبرجی لاہور]

۴۶۔ مولانا غلام محمد صادق رحمہ اللہ [شیخ الحدیث: جامعہ اسلامیہ چارسدہ، مدیر: ماہنامہ النصیحہ]

۴۷۔ مولانا عبدالقیوم حقانی [مدیر وشیخ الحدیث: جامعہ ابوہریرہ نوشہرہ، سرپرست: ماہنامہ القاسم]

۴۸۔ مولانا عبدالمعبود رحمہ اللہ [مدیر: جامعہ عائشہ صدیقہ للبنات، راولپنڈی]

۴۹۔ مولانا مفتی ابولبابہ شاہ منصور [سابق نائب شیخ الحدیث: جامعۃ الرشید، کراچی]

۵۰۔ مولانا محمد مسعود ازہر [بانی وامیر: جیش محمد]

۵۱۔ مولانا ڈاکٹر محمد الیاس فیصل مدینہ منورہ [مدیر: مرکز الفیصل]

۵۲۔ مولانا مفتی اعجاز احمد صمدانی [استاذ: جامعہ دارالعلوم کراچی]

۵۳۔ مولانا محمد سلیم،لکی مروت[امیر تحریک خدام اہل سنت خیبر پختونخواہ]

۵۴۔ مولانا امداداللہ انور[استاذ الحدیث: جامعہ قاسم العلوم، ملتان]

۵۵۔ مولانا سید محمد معاویہ امجد[جانشین مولانا سید امین شاہؒ،مخدوم پور، خانیوال]

۵۶۔ مولانا جمیل الرحمٰن عباسی[مدیر: دوماہی تسکین الصدور، بہاولپور، مدیر اعلیٰ: مجلّہ صفدر]

۵۷۔ مولانا زاہد حسین رشیدی[مدیر: جامعہ اہل سنت تعلیم النساء، چکوال]

۵۸۔ مولانا عبدالجبار سلفی[امیر: تحریک خدام اہل سنت لاہور]

۵۹۔ مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل[مدیر و شیخ الحدیث: جامعہ صدیقیہ، کراچی]

۶۰۔ پروفیسر خالد شبیر

۶۱۔ مولانا محمد احمد حافظ[انچارج: اسپیشل صفحات روزنامہ اسلام، مدیر: ماہنامہ وفاق المدارس]

۶۲۔ مولانا عوام دوست

۶۳۔ مولانا عبدالبصیر راشد

۶۴۔ مولانا مفتی سمیع اللہ سعدی

۶۵۔ مولانا خالد محمود[رئیس: مرکز القرآن الحکیم، متی تل روڈ، ملتان]

۶۶۔ مولانا مفتی ضیاء الرحمٰن[جامع مسجد و مدرسہ عمر فاروق، مدرس: جامعہ عبیدیہ، فیصل آباد]

۶۷۔ مولانا پروفیسر محمد الیاس ارشد، فیصل آباد

۶۸۔ مولانا محمد انور[رئیس: جامعہ اسلامیہ عربیہ، فیصل آباد]

۶۹۔ مولانا غلام فرید[مدرس: دارالقرآن فیصل آباد]

۷۰۔ مولانا مفتی شعیب احمد[دارالافتاء الہلال مسجد، چوبرجی، لاہور]

۷۱۔ مولانا مفتی ساجد الرحیم[مدیر: جامعۃ الحسن، ماہنامہ دین کی دنیا، ساہیوال]

۷۲۔ مولانا مفتی کاشف شہزاد[دارالافتاء: جامعہ علوم شرعیہ، ساہیوال]

۷۳۔ مولانا مفتی محمد شیراز[مدیر: جامعہ العصر، پیرمحل ٹوبہ ٹیک سنگھ]

۷۴۔ مولانا مفتی محمد ذکاء اللہ[رئیس دارالافتاء: دارالعلوم ساہیوال]

۷۵۔ مولانا محمد ابوایوب حنفی قادری[خطیب: جامع مسجد عثمانیہ، جھنگ]

۷۶۔ مولانا محمود الرشید حدوٹی[مدیر اعلیٰ: ماہنامہ آب حیات، مدیر: جامعہ رشیدیہ، لاہور]

۷۸۔ مولانا مفتی سید نذیر احمد بخاری [رئیس: دارالافتاء: جامعہ فاروق اعظم، فیصل آباد]

۷۹۔ مولانا محمد ایوب صفدر طوفانی [مدیر: جامعہ فیضان سرفراز، گوجرانوالہ]

۸۰۔ تلمیذ امام اہل سنت مولانا محمد سیف الرحمٰن قاسم [سابق مدرس: جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانولہ]

۸۱۔ مولانا محمد اسداللہ ڈجکوٹی [مدرس: جامعہ مدینۃ العلم، فیصل آباد]

۸۲۔ مولانا محمد الیاس قاسمی [ناظم شعبہ تبلیغ: جیش محمد پاکستان، فیصل آباد]

۸۳۔ مولانا مفتی عبدالوحید [مفتی: دارالعلوم فاروقیہ، راولپنڈی]

۸۴۔ مولانا مفتی ناصر محمود [دارالعلوم فاروقیہ، راولپنڈی]

۸۵۔ مولانا محمد انور شاہ [رئیس: الجامعۃ العربیہ احسن العلوم، کراچی]

۸۶۔ مولانا پیر نعیم اللہ فاروقی [خلیفہ مجاز: خواجہ عبدالمالکؒ و حافظ غلام حبیبؒ]

۸۷۔ مولانا مفتی محمد مطیع اللہ [مرکزی ناظم اعلیٰ: عالمی مجلس احرار اسلام]

۸۸۔ مولانا محمد راشد ڈسکوی [مفتی: دارالافتاء: جامع مسجد اشتیاق، ڈسکہ، ضلع سیالکوٹ]

۸۹۔ مولانا محمد انصر باجوہ [جامع مسجد و مدرسہ امام اعظم ابوحنیفہ، راولپنڈی]

۹۰۔ مولانا ابومجاہد بالاکوٹی [فاضل جامعہ مدنیہ جدید لاہور]

۹۱۔ مولانا مفتی محمد ممتاز حنفی [فاضل جامعہ فرقانیہ مدنیہ، راولپنڈی]

۹۲۔ مولانا عبداللہ معتصم [انچارج ایڈیٹر: ماہنامہ لولاک، ملتان]

۹۳۔ ڈاکٹر محمد امین [جنرل سیکرٹری ملی مجلس شرعی، لاہور]

۹۴۔ مولانا صلاح الدین یوسفؒ [دارالسلام، لاہور]

۹۵۔ مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی [جامعہ اہلحدیث، لاہور]

۹۶۔ مولانا سید شاہ تراب الحق قادریؒ، کراچی

۹۷۔ علامہ خلیل الرحمٰن قادریؒ [جامعہ اسلامیہ، لاہور]

۹۸۔ علامہ سید محمد عمران طحاوی [خطیب جامع مسجد قباء، لاہور]

۹۹۔ حافظ ڈاکٹر حسن مدنی [جامعہ لاہور الاسلامیہ، (رحمانیہ) لاہور]

۱۰۰۔ مولانا مفتی محمود الحسن [جامعہ اسلامیہ، ڈسکہ، سیالکوٹ]

تفہیم دین آصف محمود

عمار ناصر کی شہادت حسینؓ کے بارے میں ہرزہ سرائی

سیدنا حسینؓ کو ان کی 'اجتہادی گنجائش' کی ضرورت نہیں

تو کیا اب عمار خاں ناصر ہمیں بتائیں گے کہ سیدنا امام حسینؓ کا اقدام درست تھا یا نہیں؟ جائز تھا یا حرام تھا؟ اور نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اقدام کی کوئی اجتہادی گنجائش نکلتی ہے یا نہیں؟

ہم پرندے ہیں نہ مقتول ہوائیں پھر بھی
آ کسی روز کسی دکھ پہ اکٹھے روئیں

محترم عمار خان ناصر کی ایک تحریر نظر سے گزری جس میں انہوں نے سیدنا حسینؓ کو موضوع بنایا۔ اس تحریر کے چند بنیادی نکات یہ ہیں:

۱۔ ان کا کہنا ہے کہ سیدنا حسینؓ نے خروج کیا

۲۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس خروج کا مقصد اقتدار کا حصول تھا

۳۔ عمار خان ناصر لکھتے ہیں کہ سیدنا حسینؓ کا خیال تھا کہ عوام کی اکثریت انہیں حکمران دیکھنا چاہتی ہے اور ان کی جدوجہد کی کامیابی کے امکانات بھی بظاہر موجود ہیں۔

۴۔ اس کے بعد عمار خان ناصر ہمیں بتاتے ہیں کہ ائمہ اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غیر عادل حکمرانوں کے خلاف خروج حرام ہے۔

یعنی جناب عمار خان ناصر نے آغاز اس بات سے کیا کہ سیدنا حسینؓ نے خروج کیا اور اختتام اس بات پر کیا کہ خروج حرام ہے۔

۵۔ ساتھ ہی ایک عجیب سے فکری تکبر کے ساتھ فرمایا کہ: ''تاہم ان حضرات کے اقدام کے لیے ایک اجتہادی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے اور انہیں شریعت کے کسی صریح حکم کی دیدہ و دانستہ خلاف ورزی کا مرتکب قرار دینا ممکن نہیں رہتا''۔

(یعنی نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقدام کے لیے اجتہادی گنجائش اب گوجرانوالہ کے مجتہدین کرام پیدا کریں گے)۔

جہاں تک خروج کی بات ہے تو سیدنا حسینؓ نے خروج نہیں کیا۔ اول بیعت کرنے سے انکار کیا یعنی ظالم حکمران کو ووٹ دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اتمامِ حجت کیا۔ ان کو آنے والے خطوط میں تکرار کے ساتھ لکھا گیا کہ ہم روز قیامت آپ کے نانا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے آپ کی شکایت کریں گے کہ جب احکام دین کو پامال کیا جا رہا تھا تو حسینؓ نے ہماری رہنمائی نہیں کی۔ آپ اتمامِ حجت کے لیے نکلے اور خاندان سمیت نانا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دین پر قربان ہو گئے۔ یہ خروج کہاں سے ہو گیا؟

معصوم بچوں اور خواتین کے ساتھ خروج نہیں ہوتا۔ خروج کے لیے نکلنے والوں کے ساتھ جنگجو ہوتے ہیں۔ خروج مقصود ہوتا تو سیدنا حسینؓ اہل خانہ کو ساتھ لے کر مقتل آباد نہ کرتے بلکہ آواز دیتے اور پھر ان کے ساتھ ایک لشکر ہوتا جو میدان کا رخ کرنے سے پہلے گوجرانوالہ جا کر کسی سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا کہ قبلہ ہمیں حسینؓ نے بلایا ہے اب آپ رہنمائی فرما دیجیے کہ اس کی اجتہادی گنجائش نکلتی ہے یا نہیں؟ ابھی تو آپ کا کہنا یہ ہے کہ آپ کے آئمہ اہل سنت کا اتفاق ہے کہ غیر عادل حکمران کے خلاف خروج حرام ہے۔ لیکن اگر سیدنا حسینؓ نے جان قربان کرنے کی بجائے بیعت کر لی ہوتی تو آج آپ فرما رہے ہوتے کہ ظالم حکمران کی بیعت چونکہ اہلِ بیت سے ثابت ہے اس لیے واجب ہے۔

سیدنا حسینؓ کی عظیم قربانی کو حصول اقتدار کی کوشش قرار دیتے وقت ''مجتہدین کرام'' کو ان کی زندگی کا ایک جائزہ تو لے لینا چاہیے۔ کیا شہادت سے قبل سیدنا حسینؓ نے کبھی حصولِ اقتدار کے لیے جوڑ توڑ کی کوئی کوشش کی؟ اور کیا ان کی شہادت کے بعد، جب مظلومیت کی طاقت بھی ساتھ تھی، کیا حضرت زینبؓ نے ایسی کوئی کوشش کی جس کا مقصد حصولِ اقتدار ہو؟

آپ جاوید غامدی صاحب کے خوشہ چین ہیں، خاندان نبوت سے عقیدت و محبت بے شک نہ رکھیے لیکن رائے قائم کرتے وقت فکری دیانت کا مظاہرہ کرنے کی توقع ہم آپ سے نہ رکھیں تو پھر کس سے رکھیں؟

بہر حال آپ نے سیدنا حسینؓ کو ''اجتہادی گنجائش'' عطا فرمائی، آپ کا بہت شکریہ۔ بہت سے سخن ہائے گفتنی، مَیں فی الوقت خیالِ خاطرِ احباب کے لیے ناگفتہ چھوڑ رہا

ہوں تاہم خاطر جمع رکھیے، سیدہ فاطمہؓ کے بیٹے اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے کو آپ کی ''اجتہادی گنجائش'' کی ضرورت نہیں ہے۔

نواسۂ رسول کے بارے میں کہی گئی بے بنیاد بات کا ابطال اگر فرض کفایہ ہوتا تو ڈاکٹر عاصم اللہ بخش صاحب یہ فرض ادا کر چکے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ فرض عین تھا۔ اللہ کا شکر ہے میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

نوٹ: ایک وضاحت: عمار خان ناصر کے نام کے ساتھ صاحب، محترم اور جناب کے الفاظ جہاں جہاں استعمال ہوئے ان کو حذف تصور کیا جائے۔ یہ تحریر پرانی ہے جب کچھ حسن ظن باقی تھا۔ اب نہیں ہے۔ اب یہ گروہ اپنی واردات اور طریقِ واردات کے ساتھ عیاں ہو چکا ہے۔ اب یہ گروہ بالاہتمام ہجو کا مستحق ہے۔

بقیہ: امریکہ زوال کی راہ پر

بنیادی سبق

امریکا بہت تیزی سے انحطاط کی راہ پر گامزن ہوا ہے۔ ایسا اِس لیے ہوا ہے کہ اُس نے خطرناک علامات کو نظرانداز کرنے کی غلطی کی ہے۔ دنیا بھر میں مضبوط ترین ممالک ایسی ہی حالت میں زوال کی طرف گئے ہیں۔ چشمِ فلک نے بیسیوں ممالک کو طلوع اور غروب ہوتے دیکھا ہے۔ جب بھی کوئی ملک بہت زیادہ ترقی حاصل کر لیتا ہے تو اپنی بنیادی ذمہ داریوں کو بھول جاتا ہے اور اپنی طاقت ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

رونالڈ ریگن کے ادوارِ صدارت میں امریکا خاصے شورش زدہ ماحول سے دوچار رہا۔ اگر کسی نے کہا ہوتا کہ ہم ریگن کے زمانے کو امنِ عامہ اور تعقل کی اثر پذیری کے حوالے سے محض یاد نہیں کریں گے بلکہ اُس دور کو یاد کر کے سکون بھی محسوس کریں گے تو لوگ اُسے پاگل قرار دیتے۔ اب ذرا سوچیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ امریکا میں اِس وقت قانون کی علمبرداری سے جو کھلواڑ کیا جا رہا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے کیا ریگن کا زمانہ بہت اچھا دکھائی نہیں دیتا؟ (بشکریہ المعارف کراچی)۔

تفہیم دین ادارہ

دینی جماعتوں کے مناہج میں اختلاف

دین کے مختلف شعبوں میں کام دین ہی کے کام ہیں

ہر شخص کا ایک میدان ہوتا ہے اور وہی اس کا جہاد ہوتا ہے۔ اس دین نے کبھی خالد بن ولیدؓ کی تلوار کا تقاضا کیا جب معرکہ سخت ہوا اور کبھی حسّان بن ثابتؓ کی شاعری کا جب فکری معرکہ شدت اختیار کر گیا۔ خالدؓ حسّانؓ کی جگہ نہ لے سکے اور نہ ہی حسّانؓ خالدؓ کی۔

اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو ایک ایک مورچے پر کھڑا کیا ہے۔ ہر ایک کا ایک مخصوص مقام ہے جس کا اسے دفاع کرنا ہے۔ نہ اسے اپنے مورچے کو کمتر سمجھنا چاہیے اور نہ یہ گمان کرنا چاہیے کہ اس کا مورچہ سب سے اعلیٰ ہے۔

غزوۂ تبوک میں جب لشکرِ عسرہ کو مال درکار تھا تو عثمانؓ کا مال سب سے قیمتی تھا لیکن جب قرآن کو جمع کرنے کا مرحلہ آیا تو ابی بن کعبؓ کی قراءت عثمانؓ کے مال، خالدؓ کی تلوار اور حسّانؓ کی شاعری سے بھی زیادہ اہم بن گئی۔ لہٰذا جب تمہاری باری آئے تو شیر بن کر اٹھو۔

خیبر میں جب علیؓ نے مرحب جیسے دشمن کو للکارا تو ان کی تلوار اتنی ہی قیمتی تھی جتنی وہ رقم جس سے ابوبکرؓ نے بلالؓ کو آزاد کرایا۔ یہ دونوں مختلف کام تھے اور دونوں ہی عظیم۔ یہ دین کی تکمیل ہے، مقابلہ نہیں۔ یہ یکجہتی ہے، برتری نہیں۔

آج بھی یہی حال ہے۔ امت کے سامنے بہت سے محاذ ہیں اور ہر مسلمان ایک محاذ پر کھڑا ہے۔ ماں اپنے گھر میں ایک مورچے پر ہے کیونکہ مردوں کی تربیت وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ استاد اپنے کمرۂ جماعت میں ایک مورچے پر ہے کیونکہ جاہل امت کبھی قائد نہیں بن سکتی۔ مجاہد ایک ایسا مورچہ سنبھالے ہوئے ہے جو مسجد کا امام نہیں سنبھال سکتا اور امام مسجد ایک ایسا مورچہ سنبھالے ہوئے ہے جو تاجر نہیں سنبھال سکتا۔ اور کسی تاجر کی سخاوت، صدقہ و خیرات اور حاجت مندوں کی مدد اسی قدر اہم ہے جیسے کسی مجاہد کی قربانی یا امام کی ہدایت۔

دیکھو! اللہ نے تمہیں جہاں کھڑا کیا ہے، وہی تمہارا مورچہ ہے۔ اسے مضبوطی سے تھامو، وہیں جہاد کرو اور اپنا کردار ادا کرو۔ جب ہر شخص اپنا کام کرے گا تب یہ امت اپنا کھویا ہوا مقام واپس پائے گی۔ لہٰذا ابتداء اپنے آپ سے کرو، دوسروں کا انتظار نہ کرو۔

شذرات مدیر

قانونِ توہینِ رسالت پر نیا حملہ

* مغرب (امریکہ، یورپ اور اس کے حمایتیوں) کو پاکستانی مسلمانوں کی دین دوستی اور خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت اور اس محبت کا مظہر قانونِ توہینِ رسالت اسی طرح کھٹکتا ہے جس طرح ابلیس نے بقول اقبال یہ کہا تھا کہ ''مَیں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح''۔ وہ علی الاعلان اس قانون کی مخالفت کرتے ہیں اور اپنے ایجنٹ حکمرانوں، سیکولر اور لبرل دانشوروں، وکلاء اور ججوں پر ان کا دباؤ رہتا ہے کہ وہ اس قانون کی مخالفت کریں۔ چنانچہ سیکولر، لبرل، ہیومنسٹ وکلاء اپنے ایک ہم خیال ہائیکورٹ کے جج کے پاس اپنا کیس لے گئے جس نے اس قانون کے غلط استعمال پر ایک کمیشن بنا دیا۔

* ان وکلاء (اور جج) کے پیش نظر اس کمیشن سے کیا ہے؟ یہ کہ جو ہیومنسٹ، سیکولر، لبرل، ملحد اور کافر توہین رسالت کرتے ہیں ان کے خلاف کیسوں کو غلط قرار دے کر ان کے لیے آسانیاں پیدا کی جائیں۔ یہ ثابت کیا جائے کہ اس طرح کے کیسز غلط ہیں اور اس قانون کا بہت زیادہ غلط استعمال ہو رہا ہے لہٰذا اس قانون کو ختم کر دیا جائے یا اسے نرم کر کے غیر مؤثر بنا دیا جائے۔

* مذکورہ بالا نکات پر مبنی علماء کرام اور دینی حلقوں کا مؤقف درست ہے لیکن اس تلخ حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض علماء کرام اور دینی حلقے اس قانون کا واقعی غلط استعمال کرتے ہیں اور اپنے مسلک کے مخالفین پر توہین رسالت کے جھوٹے پرچے کٹواتے ہیں۔ اس لیے علماء کرام کو اپنی منجی کے نیچے بھی ڈنگوری پھیرنی چاہیے اور ملک میں فرقہ پرستی کے سیلاب پر روک لگانے کی فکر کرنی چاہیے۔

* دینی حلقوں اور علماء کرام کو اپنی اس کمزوری کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ انہوں نے آج تک ملک میں جاری مغرب زدہ جدید نظامِ تعلیم کی اسلامی تناظر میں اصلاح کے لیے کچھ نہیں کیا خصوصاً قانون کی تعلیم میں شرعی مضامین کے اضافے اور قانون کے طلباء کی اسلامی تربیت اور وکلاء اور ججز کی اسلامی تعلیم و تربیت کے کام کو انہوں نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ ہم

عرض کرتے ہیں کہ انہیں اپنے موجودہ دینی کاموں پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس اہم کام کی طرف لازماً پیش قدمی کرنی چاہیے ورنہ سیکولر اور لبرل وکلاء اور ججز تو اپنی من مانی کرتے رہیں گے اور وہ ان کے خلاف محض جذباتی بیان بازی کرتے رہیں گے جس سے مسئلہ مستقلاً حل نہیں ہوگا۔

غزہ کب تک تڑپتا رہے گا؟

کیا دنیا میں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ دشمن مارے اور رونے بھی نہ دے۔ اسرائیلی وحشی حکومت نے پہلے غزہ کو تباہ کیا۔ پھر ان لوگوں پر حملے شروع کر دیے جو ہسپتالوں یا سکولوں یا اقوام متحدہ کے اداروں میں پناہ لیتے تھے۔ اب اس نے ان نہتے فلسطینیوں پر حملے شروع کر رکھے ہیں جو راشن لینے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور اب تو بچے بھوک سے مرنا شروع ہو گئے ہیں۔ اس نے ان بیسیوں صحافیوں کو بھی شہید کر دیا ہے جو وہاں کی خبریں دنیا تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ امریکہ اور یورپ نے اسرائیل کی کھلم کھلا حمایت کر کے درحقیقت اس جنون، وحشت اور بربریت کی حمایت کی ہے۔

مزید یہ کہ اقوام متحدہ جو بنائی ہی اس لیے گئی تھی کہ دنیا میں جنگوں کو روکے اور امن قائم کرے وہ اسرائیلی حملوں کو روکنے میں مکمل ناکام ہو چکی ہے اور اس کے سیکرٹری جنرل اور دیگر ادارے محض بیان بازی تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ معاملہ جب بھی سلامتی کونسل میں اٹھایا جاتا ہے امریکہ ڈھٹائی سے اسے ویٹو کر دیتا ہے۔

ستم پر ستم یہ کہ مسلم امہ ابھی تک سوئی ہوئی ہے۔ مسلم اتحاد کی تنظیم OIC محض وزرائے خارجہ کی ملاقاتوں اور غیر مؤثر بیان بازی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ پچاس سے زیادہ آزاد (؟) مسلم ملکوں کے حکمران بے حس و بے حمیت بن کر رہ گئے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ سب امریکہ و یورپ کے غلام ہوں۔ ان کے سینوں میں مسلم امہ کا درد ہی نہ ہو۔ شاید ہی کسی نے غزہ (اور فلسطین) کی عملی مدد کی ہو سوائے چند غیر مؤثر بیانات کے۔ ہم کسی کو کیا کہیں خود دنیا کی واحد ایٹمی طاقت پاکستان اور ان کے سیاسی و عسکری حکمرانوں نے ایک تگڑا بیان بھی غزہ کی حمایت میں جاری نہیں کیا، چہ جائیکہ کہ غزہ کی عملی مدد کرتے تاکہ امریکہ جو ان کا مائی باپ ہے، وہ ناراض نہ ہو جائے، عملی مدد تو دور کی بات ہے سوائے چند ہوائی جہاز خوراک وادویات کے

بھجوانے کے۔ تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو۔

اسرائیل و امریکہ کا ایران پر حملہ

مسلم اُمّہ : یہ انتشار اور بے حمیتی کب تک؟

'ابراہام ایکارڈ' کے نام پر اسرائیل کو تسلیم کرنے بلکہ اس سے دوستی کرنے کی 'مجبوری'

اسرائیل نے غزہ (فلسطین) کو تباہ کرنے کے بعد لبنان اور شام کو تباہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی یمنی حوثیوں اور لبنان میں موجود حزب اللہ کو تہ تیغ کیا۔ اس دوران ابراہام ایکارڈ کے نام پر بحرین، متحدہ عرب امارات، مراکش وغیرہ کو اسرائیل سے دوستی پر مجبور کیا۔ مصر پہلے ہی مغلوب تھا۔ اب شام میں بھی امریکی و اسرائیلی حمایت یافتہ حکومت کردی گئی ہے (ذرا ان ''مجاہدین'' کے چہروں کو پہچانیے جو 'ھیئۃ التحریر الشام' کے نام کے پردے میں درحقیقت امریکی ایجنٹ تھے جیسا کہ ان کی امریکی حمایت نے ساری دنیا کو علی الاعلان بتادیا جبکہ ہمارے ہاں کے خوش فہم دینی حلقے انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان احادیث کے مصداق بتا رہے تھے جن میں آپ نے قیامت سے قبل کے حالات پر روشنی ڈالی ہے)۔

ہم دوسروں سے کیا کہیں خود ہماری فوج کے سپہ سالار صاحب ان دنوں عالم کفر کے سردار کے دربار میں حاضر کیے گئے جب اسرائیل ایران جنگ زوروں پر تھی اور جب غزہ کے نہتے تباہ ہوتے شہری عالم اسلام کی طرف ڈبڈبائی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ ہے کوئی جوان کے آنسو پوچھے؟ انہوں نے شیطان کبیر کے کون کون سے احکام ماننے کا اقرار کیا یہ وقت ہی بتائے گا۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ انہیں ڈانٹ کر کہا گیا تھا کہ پاکستان افغانستان میں امریکی مفادات کے لیے کام کرے اور یہ کہ وہ ابراہام ایکارڈ پر دستخط کر کے اسرائیل کو قبول کرے.... وغیرہ وغیرہ۔ اللہ کرے کہ ایسا نہ ہو اور یہ محض افواہیں اور اندازے ثابت ہوں۔

ہم کہتے ہیں کہ عالم اسلام اگر مغربی یلغار سے بچنا چاہتا ہے تو اس کے پاس اتحاد کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ورنہ ایک کے بعد ایک کی باری آتی جائے گی اور سب منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ صدام، قذافی اور ملّا عمرؒ کے بعد ایران کی باری آئی اور اگر ایران زیر ہو جاتا تو اگلی باری پاکستان کی تھی۔ کیا مسلم ممالک تباہی کے لیے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں؟ خدا کا خوف

کرو اور عقل سے کام لو۔ دشمن کو سمجھو۔ دشمن اسے صلیبی جنگ سمجھ کے لڑ رہا ہے کہ مسلمان ممالک میں سے جو بھی سر اٹھائے اسے کچل دو لیکن تم متحد ہونے کو تیار نہیں، اپنے وسائل مجتمع کر کے اپنا دفاع کرنے کو تیار نہیں۔

ان مشکل حالات میں اللہ تعالیٰ نے دو معجزے دکھائے۔ ایران نے اسرائیل وامریکہ سے شکست تسلیم نہیں کی اور اسی طرح پاکستان نے کافر بھارت کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ پاکستان اور ایران کی اس بہادری پر بلاشبہ یہاں کے سیاسی وعسکری حکمران قابل تعریف ہیں لیکن اتنا ہی کافی نہیں۔ آئندہ اس سے زیادہ سخت جواب کے لیے تیاری ضروری ہے اور اس کے لیے عالم اسلام کا اتحاد پہلی شرط ہے۔ کم از کم اس خطے کے مسلم ممالک ہی آپس میں اتحاد کر لیں تا کہ مستقبل میں مزید مضبوطی اور استحکام پیدا ہو اور اسرائیل وامریکہ جیسے اسلام ومسلم دشمنوں کو ان پر حملے کی جرأت نہ ہو۔

بین المسالک اتحاد۔ وقت کی اہم ضرورت

پچھلے کئی ماہ سے جوبلی ٹاؤن لاہور میں مختلف مسالک کے علماء کے درمیان ایک مسجد پر قبضے کی مہم میں ’’جنگ‘‘ چھڑی ہوئی ہے۔ ہم ملی مجلس شرعی کے بانی جنرل سیکرٹری ہیں جس کا بنیادی ہدف ہی بین المسالک آہنگی اور یکجہتی کو فروغ دینا ہے اور یہ مجلس اس حوالے سے ہمیشہ کوشاں رہی ہے۔ توہینِ رسالت کے حوالے سے بھی بعض دینی مسالک ایک دوسرے سے شکوہ کناں ہیں۔ ہم مسالک کے بڑے علماء (خصوصاً ’اتحاد تنظیمات مدارس‘ کے رہنماؤں) سے درخواست کریں گے کہ وہ اس موضوع پر ایک خصوصی اجلاس منعقد کریں اور بین المسالک ہم آہنگی کا ایک مضبوط پیغام اپنے جونئر کیڈرز کو دیں کہ یہ فرقہ واریت دین کے لیے نقصان دہ ہے۔

مسجد اسلام میں مرکز کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اس کی مرکزیت تب ہی قائم ہوتی ہے جب مسجد کو مسلک کی بنیاد پر نہیں دین کی بنیاد پر آباد کیا جائے۔ گورنمنٹ بھی اس بات پر توجہ دے کہ مساجد کو مسلک کی بنیاد پر رجسٹر نہ کیا جائے بلکہ کیا ہی اچھا ہو کہ اذان، نماز، وجمعہ میں تینوں مسالک کو نمائندگی دی جائے تا کہ آہستہ آہستہ یہ نفرت اور دُوریاں کم ہوتی جائیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دین کے نام پر جمع ہوا جائے اور مسلکی اختلافات کو برداشت کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ یہ ہرگز تکفیر کا موضوع نہیں اور نہ اس اختلاف کو تحزب، تعصب اور نفرت میں بدلنا چاہیے۔

مقالۂ خصوصی

صابر علی [1]

مغربی فکر و تہذیب کی پیدا کردہ جدید ریاست نہ صرف غیر اسلامی ہے بلکہ اسے اسلامی بنایا بھی نہیں جاسکتا

ریاست کی ماہیت کا مسئلہ

سہ ماہی ''اسلامی انقلاب'' کراچی کے مدیر ڈاکٹر علی محمد رضوی کی فکر کا تجزیہ

[البرہان کے شمارہ جولائی ۲۰۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر محمد عثمان صاحب کا مضمون ُریاست کی اسلامائزیشن ُ کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ہم نے بھی ان کے نقطۂ نظر کی حمایت کی تھی۔ اس کے جواب میں مدیر سہ ماہی ُاسلامی انقلاب ُ کراچی (تاحال آن لائن جریدہ) جناب ڈاکٹر علی محمد رضوی صاحب نے اپنے جریدے کے شمارہ نمبر ۳ میں ایک طویل مضمون اس موضوع پر ُکیا ریاست جدیدیت و سرمایہ داری کی اختراع ہے؟ کے عنوان سے لکھا۔ انہی کے حلقے کے صابر علی صاحب نے اس مضمون پر عمدہ تبصرہ کیا ہے اور ڈاکٹر عثمان صاحب اور البرہان کے نقطۂ نظر کی حمایت کی ہے۔ مدیر]

مدیر "اسلامی انقلاب" ڈاکٹر علی محمد رضوی کا شمارہ نمبر 3 میں صفحہ نمبر 70 تا 92 ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے: "کیا ریاست جدیدیت و سرمایہ داری کی اختراع ہے؟"۔ اس مضمون میں آپ نے اپنا موقف مربوط اور مدلل انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ریاست کی ماہیت، اس کے جبری کردار اور اس کی کلیت پسندی کے تصور پر ایک جامع موقف پیش کیا ہے اور قدیم و جدید ریاستوں کے مابین ایک اصولی تسلسل قائم کر کے دکھایا گیا ہے۔

آپ کا مدعا یہ ہے کہ ریاست اپنی ماہیت میں ایک جبری اور کلیت پسند ادارہ ہے جو اپنے دائرہ کار میں خود کو "وحدہ لاشریک" سمجھتا ہے۔ اور یہ جو ہر قدیم و جدید تمام ریاستوں میں مشترک ہے، اگرچہ اس کے عملی اطلاق کی صورتیں مختلف رہی ہیں۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے آپ نے چند دلائل پیش کیے ہیں۔ اس پورے مضمون میں کئی منطقی مغالطے، فکری اختلال اور غلط نتائج موجود ہیں جو مفصل تجزیے سے عین واضح ہو جاتے ہیں۔ ہم نے وہ مفصل تجزیہ کیا بھی ہے لیکن فی الحال اسے روک کر یہ نیا مضمون مرتب کیا ہے۔

---

[1] محقق، مترجم اور دانشور۔ مدیر معاون سہ ماہی ُاسلامی انقلاب ُ کراچی

رضوی صاحب کے مضمون میں ایک بڑا خلا یہ ہے کہ جن لوگوں کا موقف آپ رد فرما رہے ہیں ان کا صراحت سے کوئی ذکر نہیں ملتا کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے اور پھر اس دعوے کو بنیاد بناتے ہوئے مسلمانوں کو با اقتدار اور باوقار نہیں دیکھنا چاہتے یا ریاست کے جدید اختراع ہونے کا موقف اختیار کر کے کسی مسلمان حکومت کے خلاف برسر پیکار ہیں یا اس پر کسی قسم کا فتویٰ دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس مضمون میں ایسے "مفروضہ مسلمانوں" کا موقف یا ان کا مقصد ہمیں نظر نہیں آتا یا ان کے دلائل مفصل طور پر نہیں ملتے۔ اگر آپ ایسی تحریروں کا حوالہ دے دیتے جن میں یہ مؤقف پیش ہوا ہے تو قارئین کو کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے میں بڑی مدد ملتی۔ بہر حال رضوی صاحب کے مضمون اور ان کے نتائج بحث وفکر سے اختلاف کرنے کے باوجود یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ہم جمہور امتِ مسلمہ سے منسلک کسی بھی ایسی قابلِ ذکر شخصیت یا گروہ سے واقف نہیں ہیں جو مسلمانوں کے برسرِ اقتدار آنے، حکومت قائم کرنے اور شریعت نافذ کرنے کے خلاف ہو۔ اب ہم نفسِ مضمون کی طرف آتے ہیں۔

۱۔ ریاست کی ''اصولی کلیت'' پر اعتراض

آپ نے اپنی پوری عمارت جس بنیاد پر کھڑی کی ہے وہ ریاست کی "اصولی کلیت" اور اس کا "بلا شرکت غیرے حاکم" ہونے کا تصور ہے۔ آپ کا یہ دعویٰ خود محلِ نظر ہے۔ آپ نے ریاست کا ایک مخصوص تصور (جو میرے نزدیک جدید مغربی فکر سے ماخوذ ہے) قائم کیا اور پھر اسی عینک سے پوری انسانی تاریخ کو دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی پہلے سے نتیجہ طے کر لے اور پھر اس کے مطابق شواہد تلاش کرے۔

ہمارے علمی ورثے میں ریاست یا سلطنت کا تصور آپ کے بیان کردہ تصور سے یکسر مختلف ہے۔ آپ نے ریاست کو معاشرے پر مسلط ایک جبری قوت قرار دیا ہے جس کی حاکمیت مطلق ہے (اس دعوے کے باوجود کہ حقیقی حاکمیت صرف اللہ کی ہے)۔ اسلامی روایت میں خلیفہ یا سلطان کی حیثیت حاکمِ مطلق کی نہیں بلکہ شریعت کے نفاذ کے ذمہ دار ایک امین اور نگران کی ہے۔

آپ نے ریاست کو "وحدہ لا شریک" قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک حاکمیتِ مطلقہ

صرف رب العالمین کی ہے۔خلیفہ یا سلطان تو خود شریعت کا پابند اور اس کے سامنے جوابدہ ہے۔اس کا اختیار مشروط ہے، مطلق نہیں۔ وہ قانون بناتا نہیں، قانون نافذ کرتا ہے۔قانون (شریعت) اس سے بالاتر ایک حقیقت ہے جبکہ آپ کی پیش کردہ "کلّی" ریاست خود قانون کا حتمی سرچشمہ بننے کی دعوے دار ہے۔لہٰذا، آپ نے جس "اصولی کلیت" کو ریاست کی لازمی صفت قرار دیا ہے وہ کم از کم اسلامی تاریخ کی ریاستوں پر تو صادق نہیں آتی۔ان کی بنیاد ہی حاکم کی طاقت کو محدود اور مشروط کرنے پر تھی۔

۲۔"تمنا" کو"ماہیت" قرار دینے کا مغالطہ

آپ نے یہ دلیل دی کہ اگرچہ ماقبل جدید ریاستیں عملاً کمزور تھیں لیکن ان میں واحد، بالادست اختیار کی تمنا عموماً موجود تھی۔ یہ ایک کمزور دلیل ہے۔کسی شے کی تمنا یا خواہش اس کی حقیقت یا ماہیت کو ثابت نہیں کرتی۔

ایک فقیر ساری زندگی امیر بننے کی "تمنا" کر سکتا ہے لیکن اس تمنا کی بنیاد پر ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ اس کی "ماہیت" امیری ہے۔اسی طرح، اگر کسی بادشاہ نے اپنی طاقت کو ہر حریف سے بالاتر کرنے کی کوشش کی تو یہ اس کا سیاسی ambition تو ہو سکتا ہے لیکن یہ ثابت نہیں کرتا کہ ریاست کا بنیادی تصور ہی "کلیت پسندی" ہے، بلکہ اس کا دوسرا رخ اس "تمنا" پر حکم لگانا بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کسی کی ایسی تمنا ہے تو کیا وہ درست ہے یا نہیں۔ بادشاہوں میں تو کئی قسم کی تمنائیں ثابت کی جا سکتی ہیں اور ان کا انحرافی کردار بھی تاریخ میں رقم ہے۔اب ان کی تمام تر تمناؤں یا انحرافات کو سامنے لا کر اسے مطلوب و مقصود یا معیار نہیں بنایا جا سکتا۔تمنا کا اظہار بذات خود ماہیتی اور وجودی تحدیدات کا اشارہ ہے،کلیت کا نہیں۔ بادشاہوں اور امراء کی کشمکش اکثر مخصوص حقوق،محصولات یا زمینوں پر ہوتی تھی نہ کہ حاکمیتِ مطلقہ کے کسی تجریدی نظریے پر۔آپ نے بادشاہ کی خواہش کو ریاست کا جوہر بنا کر پیش کر دیا جو منطقی طور پر درست نہیں۔

۳۔ریاستی تعقل کی یک رخی تعبیر

آپ کا یہ کہنا کہ قدیم حکمران علماء اور شعراء کی سرپرستی اس لیے کرتے تھے کہ وہ ایک مخصوص "ریاستی تعقل" کی آبیاری اور حفاظت کریں، تاریخ کی ایک نہایت سادہ اور یک رخی

تعبیر ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست ہو سکتی ہے لیکن اسے کلیہ بنا کر پیش کرنا علم وفکر کی تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہے۔

کیا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے "احیاء علوم الدین" سلجوقی سلاطین کے "ریاستی تعقل" کو جواز فراہم کرنے کے لیے لکھی تھی؟ کیا ائمہ اربعہ نے فقہ کی تدوین عباسی خلفاء کی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے کی تھی؟ ہر گز نہیں۔ یہ عظیم ہستیاں علم کو اللہ کی امانت سمجھ کر اس کی خدمت کر رہی تھیں۔ ان کا اولین مقصد منشائے الٰہی اور شریعت کی تفہیم وتشریح تھا۔ حکمران اکثر ان کی علمی وجاہت اور عوام میں ان کی مقبولیت کی وجہ سے ان کی عزت کرنے پر مجبور تھے۔ یعنی اکثر صورتوں میں بادشاہ کو اپنی بقا کے لیے علماء کے قائم کردہ "شرعی تعقل" کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا، نہ کہ علماء ریاست کا تعقل پیدا کرتے تھے۔ آپ نے معاملے کو الٹا کر پیش کیا ہے۔

درج بالا تین نکات اس نتیجے کی تردید کرتے ہیں کہ ریاست اپنی اصل میں ہمیشہ سے ایک "کلی" ادارہ رہی ہے۔ مسلم اقتدار اپنی ساخت، اپنے مقصد اور اپنے تصورِ اختیار میں جدید ریاست سے جوہری طور پر مختلف تھا۔ یہاں پر یہ معقول سوال کیا جا سکتا ہے کہ ہماری تاریخ سے کوئی ایسی ٹھوس دلیل یا نص پیش کی جائے جہاں کسی مستند فقیہ یا مفکر نے حاکم یا ریاست کو ایسا "کلی" اور "بلاشرکت غیرے" اختیار تفویض کیا ہے جو جدید ریاست کی جوہری خصوصیت ہے؟

مضمون میں صفحہ نمبر 74 کے آخر سے صفحہ نمبر 76 کے شروع تک کی بحث میں آپ نے ان محققین کے دعوے کو رد کیا ہے جو جدید ریاست کی امتیازی خصوصیت اس کی "بے نامی" اور شخصِ قانونی کے تصور کو قرار دیتے ہیں اور یہ دلیل دیتے ہیں کہ چونکہ یہ تصورات ماقبل جدید دور میں موجود نہ تھے لہٰذا ریاست بھی موجود نہ تھی۔

آپ کا جواب دو حصوں پر مشتمل ہے:

ا۔ یہ دعویٰ غلط ہے کہ "شخصِ قانونی" کا تصور نیا ہے۔ یہ قدیم قوانین، بشمول اسلامی قانون میں بھی موجود تھا۔

۲۔ ریاست کی بے نامی کے لیے "شخصِ قانونی" کا تصور ناگزیر نہیں بلکہ "تعقل" کا تصور ہی کافی ہے جو خود ایک مجرد اور بے نام حقیقت ہے۔

ا۔کیا "شخصِ قانونی" کا تصور اسلامی فقہ میں موجود تھا؟

آپ کا یہ دعویٰ کہ "شخصِ قانونی" کا تصور ہمارے فقہی ورثے میں موجود تھا، بڑی حد تک سادگی پر مبنی ہے۔

یہ درست ہے کہ ہماری تاریخ میں بعض ایسے ادارے موجود تھے جو افراد سے ماورا ایک حیثیت رکھتے تھے جیسے وقف اور بیت المال۔ ایک وقف شدہ جائیداد کسی فردِ واحد کی ملکیت نہیں رہتی بلکہ اس کے منافع ایک مخصوص مقصد کے لیے مختص ہو جاتے ہیں۔اسی طرح بیت المال بھی تمام مسلمانوں کا مشترکہ خزانہ ہے نہ کہ خلیفہ کی ذاتی ملکیت۔لیکن یہاں ایک بنیادی اور جوہری فرق ہے جسے آپ نے نظر انداز کر دیا ہے۔فقہ میں وقف یا بیت المال ایک "ذمہ کے حامل شخص" کی طرح نہیں ہیں۔ان پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا، وہ کسی کے ساتھ معاہدہ نہیں کر سکتے۔ ان کے معاملات کی نگرانی ایک ناظر یا متولی (وقف کی صورت میں) یا خلیفہ/عامل (بیت المال کی صورت میں) کرتا ہے جو ایک حقیقی انسان ہے۔تمام قانونی ذمہ داریاں اور حقوق اسی حقیقی شخص سے وابستہ ہوتے ہیں نہ کہ اس مجرد ادارے سے۔ وقف خود سے خرید وفروخت نہیں کرتا، اس کا متولی کرتا ہے۔اس کے برعکس، جدید "شخصِ قانونی" ایک مکمل قانونی وجود ہے جو خود معاہدے کر سکتا ہے، جائیداد کا مالک ہو سکتا ہے اور اس پر مقدمہ بھی چلایا جا سکتا ہے، اور یہ سب کچھ ان افراد سے بالکل الگ اور ماورا ہے جو اسے چلاتے ہیں۔ یہ تصور ہماری فقہ میں موجود نہیں تھا۔ لہٰذا، آپ کا یہ دعویٰ کہ یہ تصور پہلے سے موجود تھا، درست نہیں۔ آپ نے دو مختلف چیزوں کے درمیان ایک سطحی مماثلت دیکھ کر انہیں ایک ہی قرار دے دیا جو ایک منطقی مغالطہ ہے۔

۲۔ "تعقل" بطورِ بے نام بنیاد

آپ کا دوسرا نکتہ زیادہ لطیف اور زیادہ خطرناک ہے۔آپ فرماتے ہیں کہ ریاست کی بے نامی کے لیے "شخصِ قانونی" کی ضرورت نہیں بلکہ "ریاستی تعقل" ہی کافی ہے جو خود ایک مجرد اور بے نام چیز ہے۔ یہاں آپ نے فقہ کی ٹھوس زمین چھوڑ کر ایک فلسفیانہ چھلانگ لگائی ہے۔

تعقل بذاتِ خود کوئی عامل نہیں۔ یہ ایک صفت ہے، ایک طریقہ کار ہے لیکن یہ خود کوئی

وجود نہیں رکھتا جو حقوق وفرائض کا حامل ہو۔ جیسا کہ آپ نے خود مثال دی کہ زبان افراد کے بغیر موجود نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح "تعقل" بھی ہمیشہ کسی عاقل کا ہوتا ہے۔ آپ کس کی طرف ذمہ داری منسوب کریں گے؟ کیا آپ "تعقل" پر مقدمہ چلائیں گے؟ کیا آپ "تعقل" سے معاہدہ کریں گے؟

اسلامی روایت میں اختیار اور ذمہ داری ہمیشہ ایک شخصِ حقیقی سے وابستہ ہوتی ہے۔ حاکم، قاضی یا عامل اپنے فیصلوں کا ذاتی طور پر دنیا میں قانون کے سامنے اور آخرت میں اللہ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس کا اختیار اس کے منصب سے تو آتا ہے لیکن اس کی ذمہ داری اس کی ذات سے الگ نہیں ہوسکتی۔ "ریاست" یا "حکومت" کے نام پر ظلم کر کے کوئی حاکم یہ نہیں کہہ سکتا کہ "یہ تو ریاستی تعقل کا تقاضا تھا، میں بری الذمہ ہوں، ریاستی تعقل کو سزا دی جائے!" بلکہ وہ ذاتی طور پر اس ظلم کا ذمہ دار ہوگا۔

جدید ریاست کا تصور ہی اس ذاتی ذمہ داری کو ختم کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ وہاں فرد ایک بے نام نظام کے پرزے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ذمہ داری "نظام" یا "کارپوریشن" پر ڈال دی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا بنیادی انقطاع ہے جسے آپ محض "تعقل" کی تجریدی اصطلاح کے پردے میں چھپا نہیں سکتے۔ آپ کا "بے نام تعقل" کا نظریہ مسئولیت کے تصور کو تحلیل اور منہدم کر دیتا ہے جو ہمارے پورے نظامِ عدل و اخلاق کی بنیاد ہے۔ لہٰذا ریاستی تعقل منطقی اور فقہی اعتبار سے محال اور اسلامی فکر کے قلب میں خنجر ہے۔

لہٰذا درج بالا دونوں نکات اسی مؤقف کے مؤید ہیں کہ ماقبل جدید سیاسی بندوبست اور جدید ریاست میں ایک جوہری فرق ہے۔ جدید ریاست ایک بے نام، مجرد اور قانونی شخصیت کی حامل اکائی ہے جس کا تصور اسلامی روایت میں موجود نہیں تھا۔ ہمارے یہاں اختیار ہمیشہ ایک ذمہ دار اور جوابدہ شخصِ حقیقی کے پاس رہا ہے۔

اس لیے پہلے حصے میں کیا گیا سوال یہاں ترمیم کر کے یوں کیا جا سکتا ہے کہ آپ اسلامی فقہ سے کوئی ایسی نظیر پیش کریں جہاں بیت المال یا وقف براہِ راست قانونی معاہدوں کا فریق بنتا تھا یا اس پر براہِ راست مقدمہ چلایا گیا یا اس نے مقدمہ لڑا؟

مضمون میں صفحہ 76 کے شروع سے صفحہ 79 کے آغاز تک کی بحث میں آپ نے محض دعویٰ کرنے کی بجائے اپنے مخالفین کے دعوے کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے "قوی تعبیر" اور "ضعیف تعبیر" میں تقسیم کیا ہے۔ آپ نے بڑی خوب صورتی سے اس دعوے کی "چونکا دینے والی قوت" کو واضح کیا ہے کہ ریاست ایک جدید تشکیل ہے۔ آپ نے اس "قوی تعبیر" کی بنیاد جن پانچ خصوصیات پر رکھی ہے یعنی تجریدی قانونی شخصیت، مطلق خود مختاری، مستقل علاقائی حدود، غیر شخصی بیوروکریسی، اور طاقت پر اجارہ داری، مَیں اس میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ یہی وہ ستون ہیں جن پر جدید ریاست کی عمارت کھڑی ہے لیکن فاضل مصنف کے یہ دلائل خود انہی کے خلاف جاتے ہیں:

۱۔ تجریدی کارپوریٹ شخصیت کا تصور ہماری فقہ اور سیاسی روایت میں موجود نہیں تھا۔ ہمارے ہاں ذمہ داری اور اختیار ہمیشہ شخصِ حقیقی سے وابستہ رہے نہ کہ کسی بے نام ریاست سے۔ لہٰذا یہ پرانی شکل کا نیا ظہور نہیں بلکہ ریاستی ایجاد ہے اور اسی ایجاد کو ریاست کا جواز بنایا جا رہا ہے اور پھر ریاست کو فطری بھی کہا جا رہا ہے۔

۲۔ آپ نے جدید ریاست کی مطلق اور ناقابل تقسیم خود مختاری کو بکھری ہوئی شکل میں دکھایا ہے۔ یہ بات آپ کے مؤقف کی تائید نہیں بلکہ تردید کرتی ہے۔ اگر اسلامی ریاست موجود تھی تو بادشاہ یا خلیفہ تو مطلق حاکمیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اور مطلق حاکمیت کے بغیر ریاست نہیں ہو سکتی تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ مطلق حاکمیت اللہ کی ہے جو ناقابل تقسیم اور غیر منتشر ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ خلیفہ کو یا کسی مقتدر گروہ کو تفویض ہو جاتی تھی تو پھر یہ دعویٰ قطعی نص کا متقاضی ہے یعنی وحی سے ثابت کیا جائے کہ خدا تعالیٰ اپنی مطلق حاکمیت مسئول اور مکلف اشخاص کے ساتھ ساتھ غیر مسئول اور غیر شخصی تصورات کو عطا کر دیا کرتا ہے۔ اس دعوے کا جو بھی پہلو دیکھا جائے، خطرناک ہے۔ کیونکہ تفویضی حاکمیت کی صورت میں یہ مسئلہ درپیش آتا ہے کہ بیک وقت متعدد ریاستیں موجود ہیں یا آپ کے بقول موجود رہی ہیں تو مطلق حاکمیت الٰہیہ ان تمام ریاستوں میں بٹ گئی، اب ہر ریاست بذات خود مطلق حاکمیت کی دعوے دار ہے۔ کیا یہ سب برابر ہوں گی، یا درجات میں ہوں گی یا صرف ایک ہی ریاست جائز ہے؟

پھر جو ریاستیں ختم ہو چکی ہیں ان کا مردہ وجود مطلق حاکمیت کے الٰہی منبع پر سوال ہے۔ اگر حاکم مطلق اللہ تعالیٰ کی حاکمیت وصول کرنے کے باوجود بھی کوئی ریاست مٹ سکتی ہے تو پھر یہ بارِ گراں اٹھانے کا کیا فائدہ؟ اگر دائرہ اختیار میں وحدہ لاشریک ہو کر بھی بقا نہیں تو پھر یہ طاقت کیسی طاقت ہے جس کی ہوس میں دین کی ساری بنیاد ہی الٹائی جا رہی ہے۔ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کسی خلیفہ نے بھی بطور حاکم مطلق دائرہ اختیار کا دعویٰ کیا تھا؟ مقصود یہ ہے کہ مطلق خود مختاری اور خلافت وسلطانی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ [۱]

۳۔ مستقل علاقائی حدود والا نکتہ بھی آپ ہی کے مؤقف کی تردید کرتا ہے۔ اسلامی سلطنت دار الاسلام کے محور پر ہوتی تھی اور یہ فقہی اکائی تھی، جدید قومی ریاست کی طرح گز اور فیتے سے ناپی ہوئی جغرافیائی اکائی نہیں۔

۴۔ غیر شخصی بیوروکریسی میں بھی جوہری فرق ہے۔ دیوان اور انتظامی اداروں کی بنیاد شخصی وفاداری، بیعت اور اطاعت فی المعروف پر تھی۔ قاضی کا تقرر بیوروکریٹک ضابطے کی میکانکی پیروی نہیں تھی۔ آپ نے خود اسے میکس ویبر کے حوالے سے جدید تصور قرار دیا ہے۔

۵۔ طاقت پر اجارہ داری بادشاہ کی تمنا تو ہو سکتی ہے لیکن اس کی محض موجودگی ہی اس تمنا کا جواز بلکہ ریاست کی ماہیت نہیں کہلا سکتی۔ بادشاہ کی سفا کی اور بربریت بھی اجارہ داری کا ثبوت نہیں بن سکتی۔

ان پانچوں نکات سے ثابت ہوتا ہے کہ جدید ریاست ان پانچوں خصوصیات کا منفرد امتزاج ہے جو ماقبل جدیدیت موجود نہیں تھا۔

صفحہ 79 تا 80 پر بحث میں آپ کا یہ کہنا ہے کہ ریاست کے نظریاتی دعووں اور زمینی حقیقت میں فرق ہوتا ہے کہ دعوے اکثر مضمر ہوتے ہیں اور یہ کہ ریاست اپنی اندرونی منطق

---

[۱] اس بحث سے واضح ہے کہ ''قراردادِ مقاصد'' میں یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات ریاست پاکستان کو منتقل کر دیے ہیں، غلط ہے اور مغرب کی الحادی فکر وتہذیب سے ماخوذ ہے جو عوام کو حاکم مطلق قرار دیتی ہے۔ مدیر

کے تحت خود آزادی عطا کرتی ہے۔

آپ کی تمام تر فصاحت اور دقیق استدلال کے باوجود آپ کا مقدمہ ایک بنیادی کمزوری سے باہر نہیں نکل سکا۔ آپ ایک ہی لفظ ”ریاست“ کو دو بالکل مختلف معانی میں استعمال کر رہے ہیں اور پھر ان کے درمیان مماثلت ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بعینہٖ وہی مغالطہ ہے جس کا الزام آپ اپنے مخالفین پر دھر رہے ہیں۔

آپ کا ریاست بطور وسیع تصور کا دعویٰ

آپ کا اصرار ہے کہ ”ریاست“ کو اس کے وسیع تر معنوں میں سمجھا جائے یعنی کوئی بھی منظم سیاسی اتھارٹی جو ایک علاقے پر حکومت کرتی ہے۔ اس وسیع تعریف کے تحت بلا شبہ مصر کے فراعنہ، روم کے قیصر اور بغداد کے خلفاء سب ”ریاست“ کے سربراہ تھے۔ اگر آپ کا دعویٰ صرف اتنا ہے تو اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس پر بحث کرنا وقت کا ضیاع ہے۔ یہ آپ کے دعوے کی وہ ”ضعیف تعبیر“ ہے جس کی کوئی ”چونکا دینے والی قوت“ نہیں۔ اگر ریاست اتنی ہی وسیع ہے کہ اس میں کالج سے میڈیا تک اور بینک سے لے کر پریشر گروپ تک سب شامل ہیں اور جامع تصورِ ریاست بناتے ہیں، تو پھر مناقشہ کس بات کا ہے اور اعتراض کس پر ہو رہا ہے؟ تمام مبلغین، دعوت و تبلیغ کی جماعتیں، مدرسین، خانقاہی افراد اور ادارے بلکہ عام مسلمان بھی تو کسی نہ کسی دائرے میں اسلام کے کسی ایک پہلو پر اپنی صلاحیت لگا رہے ہیں جیسا کہ انقلابی لوگ اپنے شعبہ میں کام کر رہے ہیں تو پھر یہ سب لوگ ریاستی تعقل ہی تو پیدا کر رہے ہیں اور تنقید کرنے والے تو ”وسیع تر ریاستی تعقل“ میں شامل بلکہ ضروری ہیں۔ اس طرح ریاست درونِ ریاست، انقلاب اور ریاست کے سماج سے بالاتر سیاسی ادارہ ہونے، جبری ہونے، عوامی جواز رکھنے وغیرہ کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ریاست کا وسیع تر تصور تسلیم کرنا آپ کی ساری تنقید بے جا بنا دیتا ہے۔ اگر ریاست کا تصور اتنا ہی وسیع ہے جیسا آپ بیان فرما رہے ہیں تو ہر مسلمان اس وسعت کا حصہ ہے چاہے وہ دین کا کوئی بھی کام کر رہا ہو، کسی بھی نوعیت میں کر رہا ہو، ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی ذاتی زندگی بھی اس میں شامل ہے کہ وہ دین کو اپنی زندگی میں لا رہا ہے اور اپنے نظم

زندگی کے طور پر قبول کر رہا ہے تو پھر نام نہاد انقلابیوں اور اقامتِ دین والوں کی عام مسلمانوں پر اور دین کے باقی کام کرنے والوں پر تنقید کیا معنی رکھتی ہے؟

دوسری طرف آپ نے ریاست کے محدود تصور میں حکومت، بیوروکریسی، پولیس، فوج، مقننہ اور عدلیہ کو شامل کیا ہے اور اس کے ظاہری ڈھانچے کو عوام کا ریاستی فہم قرار دیا ہے۔ پھر آپ نے محدود اور وسیع تصور کا آپسی تعلق بیان کرتے ہوئے ماہیت ہی کے تصور کو منتشر کر دیا ہے۔ آپ کا اصولی دعویٰ تو ریاست کی مستقل اور غیر متغیر ماہیت کا ہے لیکن جب آپ اسی ماہیت کو "اس دور کی ریاست کی مخصوص ماہیت اور تاریخی سیاق کے مطابق" (82) کہتے ہیں تو ماہیت اور شکل کا فرق قائم نہیں رکھ سکے۔ آپ کا مخالفین پر الزام ہی یہی تھا کہ وہ شکل میں تبدیلی سے ریاست کی جدید اختراعیت ثابت کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ماہیت مستقل رہی ہے جس کا ظہور مختلف شکلوں میں ہوا ہے، لیکن اپنے دعوے کے اثبات کے لیے آپ مخالفین ہی کا دعویٰ قوی بنا رہے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ریاست کی اختراعیت ماننا ناگزیر ہے۔

مغالطہ یہ ہے کہ آپ جدید ریاست کی مخصوص خصوصیات کو اس وسیع تصور پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ قدیم ریاستیں بھی نظریاتی طور پر کلیت پسند تھیں۔ یہ دعویٰ صرف تبھی درست ہوسکتا ہے اگر آپ پہلے سے یہ فرض کرلیں کہ قدیم سیاسی تنظیم اور جدید ریاست ایک ہی چیز ہیں۔ لیکن اسلامی ریاست کی نظریاتی بنیاد ہی حاکم کی طاقت کو محدود کرنا ہے۔ اس کی بنیاد کلیت پسندی پر نہیں بلکہ شریعت کی پابندی پر ہے۔ آپ ایک ایسی نظریاتی کلیت کا دعویٰ کر رہے ہیں جو اس نظام کے نظریے میں موجود ہی نہیں تھی۔ آپ جدید ریاست کے نظریے کو ماضی پر تھوپ رہے ہیں۔

آپ کا دعویٰ کہ ریاست اندرونی تعقل کے تحت آزادی دیتی ہے، معاملے کو مزید الجھا دیتا ہے۔ ایک لبرل ریاست کا چرچ کو آزادی دینا اور ایک اسلامی ریاست کا اہل کتاب کو حقوق دینا، دو یکسر مختلف اعمال ہیں جن کی بنیادیں الگ الگ ہیں۔ لبرل ریاست اس لیے آزادی دیتی ہے کیونکہ اس کا بنیادی تعقل فرد کی خودمختاری اور مذہب کو نجی معاملہ سمجھنے پر قائم ہے۔ یہ آزادی ریاستی کلیت کے اندر ایک رعایت ہے۔ اسلامی ریاست اہل کتاب کو حقوق

اس لیے نہیں دیتی کہ یہ اس کی حکمت عملی یا لچک ہے بلکہ اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا یہی حکم ہے۔ یہ اختیار خلیفہ کی مرضی پر منحصر اور مجبوری نہیں بلکہ یہ ایک شرعی ذمہ داری ہے۔ خلیفہ ان حقوق کو چھین نہیں سکتا کیونکہ یہ حقوق ریاست نے نہیں بلکہ شریعت نے عطا کیے ہیں جو ریاست سے بالاتر ہے۔ آپ ان دو بالکل مختلف اعمال کو ریاستی تعقل کی ایک ہی چھتری کے نیچے لاکر ان کے جوہری فرق کو مٹا دیتے ہیں۔

پس آپ کی ساری بحث لفظی کھیل پر منحصر ہے۔ آپ ایک ہی لفظ ریاست کو کبھی اس کے عام اور وسیع معنی میں استعمال کرتے ہیں اور کبھی اس کے خاص اور جدید معنی میں اور پھر قاری کو اس مغالطے میں ڈالتے ہیں کہ چونکہ دونوں کا نام ریاست ہے لہٰذا دونوں کی ماہیت بھی ایک ہی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ستارے اور چراغ دونوں کو روشنی کا منبع کہہ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ چراغ کی ماہیت بھی وہی ہے جو ستارے کی ہے۔ بلا شبہ دونوں روشنی دیتے ہیں لیکن ان کی حقیقت، ان کی طاقت اور ان کی ماہیت میں جوہری فرق ہے۔

لہٰذا، میں اپنا موقف پھر سے دہراتا ہوں کہ آپ جس چیز کو ماقبل جدید ”ریاست“ کہہ رہے ہیں وہ درحقیقت سلطنت یا امارت یا خلافت تھی جس کی بنیاد شخصی بیعت، شرعی ذمہ داری، اور محدود اختیار پر تھی۔ اور جسے آپ جدید ”ریاست“ کہتے ہیں وہ ایک بالکل مختلف چیز ہے جس کی بنیاد بے نام قانونی وجود، مطلق حاکمیت اور طاقت پر مکمل اجارہ داری پر ہے۔ ان دونوں کو ایک ہی نام دینا اور پھر ان کی ماہیت کو یکساں قرار دینا ایک صریح علمی غلطی ہے۔ اگر آپ کے نزدیک قدیم اور جدید ریاست کی ماہیت ایک ہی ہے تو کیا آپ یہ کہنے کو تیار ہیں کہ خلفاء راشدین کی حکومت جس کی بنیاد تقویٰ، شوریٰ اور شریعت کی پابندی پر تھی اور ایک جدید کلیت پسند ریاست جو اپنے شہریوں کی زندگی کے ہر پہلو کو کنٹرول کرتی ہے اصولی طور پر ایک ہی چیز ہیں، صرف ان کے عملی اطلاق کا فرق ہے؟

اس سے آگے صفحہ نمبر 90 تک کی بحث میں آپ نے ریاست کے محدود اور وسیع تصور میں تفریق کی، قرونِ وسطیٰ کے چرچ اور جاگیرداروں کو ”وسیع ریاست“ کا حصہ قرار دیا، انتظامی اشرافیہ کے تاریخی تسلسل پر بات کی اور آخر میں اس کے پیچھے کارفرما ”اسٹریٹجک

اہداف " کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔

یہ کاوش قابلِ تحسین ہے لیکن آپ کی یہ وسیع اور بلند و بالا عمارت جس کی تعمیر میں آپ نے اتنی محنت کی ہے، ایک بہت ہی بنیادی منطقی تضاد کی ریت پر کھڑی ہے۔ آپ نے بحث کو اتنا پھیلا دیا ہے کہ اصل نکتہ نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔

آپ کا پورا مقدمہ اس ایک نکتے پر کھڑا ہے کہ "ریاست" کا ایک وسیع تصور ہے جس میں وہ تمام ادارے اور افراد شامل ہیں جو ریاستی تعقل کو پیدا اور برقرار رکھتے ہیں۔ اس وسیع تعریف کی رو سے ریاست ہمیشہ سے موجود رہی ہے اگرچہ اس کی شکلیں (محدود تصور) بدلتی رہی ہیں۔

یہیں پر آپ کا بنیادی تضاد چھپا ہوا ہے۔ آپ نے "ریاست" کی ایک ایسی مابعد الطبیعیاتی تعریف وضع کی ہے جو اتنی وسیع اور لچک دار ہے کہ تاریخ کی ہر سیاسی تنظیم اس میں سما جائے۔ آپ نے کہا کہ چرچ "وسیع ریاست" کا حصہ تھا، جاگیردار "وسیع ریاست" کا حصہ تھے، علماء "وسیع ریاست" کا حصہ تھے۔ اگر آپ کی یہ تعریف مان لی جائے، تو پھر "ریاست" اور "منظم معاشرہ" میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے؟ آپ نے اپنے مخالفین کو شکست دینے کے لیے میدانِ جنگ ہی تحلیل کر دیا۔ آپ نے "ریاست" کی ایک ایسی تعریف کی جس پر کوئی بحث ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ہر چیز پر حاوی ہے۔

فاضل رضوی صاحب! آپ کا یہ طرزِ استدلال علم کے لیے مہلک ہے۔ جب آپ ایک تصور کو اتنا وسیع کر رہے ہیں کہ وہ اپنے متضاد (چرچ، جاگیردار جو ریاست کے اختیار کو چیلنج کرتے تھے) کو بھی اپنے اندر سمو لے تو آپ درحقیقت اس تصور کو اس کے معنی سے محروم کر رہے ہیں۔ آپ نے "ریاست" کو بچانے کے لیے "ریاست" کو ہی مار دیا ہے۔

یہ کہنا کہ چرچ قرونِ وسطیٰ کی ریاست کے وسیع تصور کا حصہ تھا، تاریخ پر مٹی لیپ دینے کے مترادف ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی پوری تاریخ بادشاہ اور پوپ کے درمیان اختیار کی کشمکش کی تاریخ ہے۔ وہ ایک دوسرے کے حریف تھے، ایک دوسرے کے اختیار کو محدود کرتے تھے۔ وہ ایک ہی ریاستی تعقل کا حصہ نہیں تھے بلکہ دو مخالف تعقلات کی نمائندگی کرتے تھے؛ ایک سیکولر شاہی طاقت کا، دوسرا روحانی کلیسائی طاقت کا۔ آپ نے ان کی صدیوں پر محیط جنگ کو

ایک ہم آہنگ "وسیع ریاست" کا نام دے دیا۔

حیرت ہے کہ اتنی وسیع تر ہم آہنگی کے باوجود دین پسپا ہو گیا، دینی قوتیں مغلوب اور ضعیف ہو گئیں۔ اگر صدیوں پر مشتمل طویل دور میں ریاست سے ہم آہنگی اور تعقلی تعلق کا نتیجہ دین کے لیے مہلک ثابت ہوا ہے تو یہی تو ہم آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ دین اور ریاست متناقض ہیں، ایک آتش ہے تو دوسرا آب ہے۔ وحدہ لاشریک حاکمیت کی ملکیت ہی بنیادی کشمکش ہے۔ دین، ریاست کی حاکمیت نہیں مانتا اور ریاست دین کی حاکمیت نہیں مانتی۔ جب بھی اور جہاں بھی دینی قوتیں اس آگ سے کھیلنے کی کوشش کریں گی، خاکستر ہو کر رہ جائیں گی۔ یہ سوال بجا ہے کہ زمانہ قدیم سے چلی آنے والی مطابقت اور موافقت آخر کشمکش میں کیوں بدل گئی؟ اگر یہ موافقت اتنی معقول، فطری اور آفاقی ہے تو پھر ریاست درون ریاست یا ریاستی اقتدار کے حصول کی جدوجہد کا مقصد کیا معنی اور جواز رکھتا ہے، وہ بھی ایسی صورت میں جب ریاست اتنی وسیع تر ہے کہ اس میں سب سماجی و دینی قوتیں لازمی طور پر شامل ہیں؟

اسی طرح جاگیرداروں کو وسیع ریاست کا حصہ قرار دینا بھی حقیقت مسخ کرنا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کی تعریف ہی طاقت کے انتشار اور مرکزی اختیار کے فقدان سے کی جاتی ہے۔ جاگیردارانہ ریاست کی ماہیت ہی جدید ریاست سے مختلف ہے اور اس پر سیاسی مفکرین کا اتفاق ہے۔ بادشاہ کی نظریاتی بالادستی اپنی جگہ لیکن عملی حقیقت یہ تھی کہ جاگیردار اپنے علاقوں میں خودمختار تھے اور اکثر بادشاہ کے خلاف ہی برسرِ پیکار رہتے تھے۔ آپ نے طاقت کے اس انتشار کو "طاقت کی تقسیم" کا خوب صورت نام دے کر اسے "وسیع ریاست" کا حصہ بنا لیا۔

یہ کہنا کہ علماء اسلامی ریاست کی "انتظامی اشرافیہ" تھے اور ان کا کام "ریاستی تعقل" کی حفاظت کرنا تھا، ہماری روایت کی سب سے بڑی توہین ہے۔ کیا امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ "ریاستی تعقل" کے محافظ تھے؟ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے وقت کے حکمرانوں کا جبر برداشت کیا، قید و بند کی صعوبتیں سہیں لیکن اپنے علمی اور فقہی مؤقف سے دست بردار نہ ہوئے۔ وہ شریعت کے محافظ تھے، سلطنت کے نہیں۔ آپ نے ان آزاد اور خود مختار علمی ہستیوں کو ریاستی کارندوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔

جب آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جدید ریاست کی بنیاد "قومی ریاست" پر ہے جس میں بیوروکریسی اور ٹیکنوکریسی ہے، اس کی بنیاد سرمایہ دارانہ ریشنلٹی پر ہے اور اس کے پاس پاسپورٹ اور سخت سرحدیں ہیں اور یہ سب چیزیں پہلے موجود نہیں تھیں تو آپ خود ہی مخالف مؤقف کو تسلیم کر رہے ہیں کہ جدید ریاست اور ماقبل جدید سیاسی تنظیموں میں ایک جوہری اور ناقابلِ عبور فرق ہے۔ پھر اس فرق کو مٹانے کے لیے آپ وسیع ریاست کا ایک دھندلا اور غیر واضح تصور لے آتے ہیں جو ایک علمی مغالطے کے سوا کچھ نہیں۔

آپ کا یہ تجزیہ کہ ریاست کے جدید ہونے کے دعوے کے پیچھے مغرب کی بالادستی قائم کرنے اور اسلامی نشاۃِ ثانیہ کو روکنے کے اسٹریٹجک اہداف ہیں، جزوی طور پر درست ہوسکتا ہے۔لیکن آپ اس کا جواب ایک غلط دلیل سے دے رہے ہیں۔ درست جواب یہ نہیں ہے کہ ہم ثابت کریں کہ "ریاست ہمیشہ سے موجود تھی"۔ درست جواب یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ اسلام کا اپنا ایک منفرد اور برتر سیاسی تصور ہے جو جدید قومی ریاست سے بہتر اور مختلف ہے۔ آپ مغرب کے بنائے ہوئے میدان میں انہی کے ہتھیاروں سے لڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے بجائے، ہمیں اپنا میدان خود بنانا چاہیے۔ ہمیں یہ دکھانا چاہیے کہ اسلام کا سیاسی نظام حاکمیتِ الٰہی، شوریٰ، عدل اور اخلاقی جواب دہی پر مبنی ہے جبکہ جدید ریاست حاکمیتِ نفس، قومی عصبیت اور مادی طاقت پر استوار ہے۔ آپ جدید ریاست کی تباہ کاریوں کا دفاع اس دلیل سے کر رہے ہیں کہ ایسی چیزیں تو پہلے بھی ہوتی تھیں۔ یہ ایک شکست خوردہ ذہنیت کی علامت ہے۔

آپ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ قدیم اور جدید ریاست میں کوئی جوہری فرق نہیں۔ آپ کے وسیع ریاست کے تصور نے معاملے کو واضح کرنے کے بجائے مزید گنجلک بنا دیا ہے اور تاریخ کی ٹھوس حقیقتوں کو ایک تجریدی نظریے کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ آپ نے ایک درست مقصد کے لیے ایک غلط راستہ اختیار کیا ہے۔

حاصل بحث میں آپ اپنے تئیں مخالفین کے مؤقف کا بوداپن واضح کر دینے اور بزعم خود مخلصانہ اور اسلامی مؤقف پر ڈٹا ہوا دیکھنے کے بعد عزم صمیم کا اعلان کرتے ہیں۔ آپ کے ان اختتامی کلمات نے بحث کا رخ ایک علمی مناظرے سے ایک جذباتی اور عملی دعوت کی طرف

موڑ دیا ہے۔ آپ نے ریاست کے وجود کی بحث کو اسلامی ریاست کے قیام کی فرضیت اور استعمار کے خلاف جہاد کے مقدس فریضے سے جوڑ دیا ہے۔ حاصلِ بحث نے آپ کے مقدمے کو مضبوط کرنے کے بجائے مزید کمزور کر دیا ہے کیونکہ اس نے اس بنیادی تضاد کو مزید عیاں کر دیا ہے جس کی نشان دہی مَیں شروع سے کر رہا ہوں۔

آپ نے سورۃ الانفال کی آیتِ مبارکہ ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ....﴾ کو اپنے مقدمے کی دلیل بنایا ہے۔ اس آیت میں بلاشبہ مسلمانوں کو دشمن کے مقابلے کے لیے "قوت" فراہم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم برحق ہے اور اس کی فرضیت سے کسی مسلمان کو انکار نہیں۔ لیکن یہ آیت یہ ثابت نہیں کرتی کہ قدیم خلافت اور جدید ریاست کی ماہیت ایک ہی ہے۔ آپ ایک حکمِ شرعی کو ایک تاریخی اور سیاسیاتی تجزیے کے ثبوت کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ یہ دو مختلف میدانوں کو آپس میں خلط ملط کرنے کے مترادف ہے۔ قوت کی فراہمی کا حکم اپنی جگہ، اور اس قوت کو منظم کرنے والی سیاسی اکائی (ریاست/خلافت) کی ماہیت پر بحث اپنی جگہ۔ آپ نے ایک شرعی فریضے سے ایک تاریخی حقیقت اخذ کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ طریقہ استدلال کے خلاف ہے۔

آپ کا یہ کہنا کہ "ریاستِ مدینہ" سے لے کر خلافتِ عثمانیہ تک ایک ہی "ریاست" تسلسل کے ساتھ قائم رہی، تاریخی طور پر بھی محلِ نظر ہے۔ نبی علیہ السلام کی قائم کردہ حکومت سے لے کر سلطنت عثمانیہ تک حکومت و اقتدار جیسا بھی ہے اور جو بھی ہے، جدید ریاست نہیں ہے۔ یہ جتنی بھی شکلیں ہیں ان سب کا جدید ریاست سے جوہری فرق موجود ہے۔ ریاست کے جدید اور مروجہ مفہوم میں ہم کسی ایک کو بھی ریاست نہیں کہہ سکتے۔ خلافت، ملوکیت یا سلطنت کی جتنی بھی شکلیں رہی ہیں، سب کی سب اسلام میں اقتدار کی جائز شکلیں ہیں، ان میں سے کوئی بھی ناجائز شکل نہیں۔ لہٰذا اسلامی علمیت نے کبھی بھی انہیں طرزِ حکمرانی کی بنیاد پر غیر اسلامی قرار نہیں دیا البتہ حکمرانوں کے اعمال سے اختلاف ضرور ہوتا رہا۔ مدینہ میں نبوی اقتدار، خلافتِ راشدہ ، بنو امیہ و بنو عباس کی ملوکیت اور پھر عثمانیوں کی سلطنت تک کے طرز حکومت اور طرز اقتدار اسلامی تحکیم ہی کا تسلسل ہیں اور ان میں سے ہر ایک جدید ریاست کی ماہیت، ساخت اور روح سے یکسر مختلف ہے۔ آپ نے ان تمام مختلف ادوار کو جدید ریاست کے تسلسل میں پرو کر ان کے درمیان موجود گہرے ساختی اور روحانی فرق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ وہی مغالطہ ہے جو

آپ پوری بحث میں دہراتے رہے ہیں۔

آپ نے بحث کے اختتام پر اپنے مخالفین کو استعمار کے ایجنٹ یا مغفلین قرار دے دیا ہے۔ یہ علمی کمزوری کی علامت ہے۔ ہمیں علمی بحث میں اپنے تجزیہ کی بنیاد بدگمانی پر نہیں رکھنی چاہیے۔ علمی موقف کا جواب علمی اور منطقی ہو، شرعی مسئلہ شرعی حکم کی روشنی میں دیکھا جائے اور جاہلانہ اور بے بنیاد دعوؤں پر سکوت اختیار کیا جائے لیکن کردار کشی اہل علم کا شیوہ نہیں۔ کیا وہ تمام مغربی مفکرین جنہوں نے ریاست کی جدید ماہیت پر لکھا یا وہ مسلمان مفکرین جو جدید ریاست کے ڈھانچے کو اسلامی تصورات سے متصادم سمجھتے ہیں، سب کے سب ایجنٹ یا کم فہم ہیں؟ یہ رویہ علمی گفتگو کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

آپ کا مقدمہ اس لیے کمزور نہیں کہ آپ اسلامی ریاست کے قیام کے حامی ہیں، اس مخلصانہ جذبے کی ہم قدر کرتے ہیں۔ آپ کا مقدمہ اس لیے کمزور ہے کہ آپ نے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک غلط علمی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ریاست ہمیشہ سے ایک ہی جیسی حقیقت رہی ہے تاکہ آپ یہ کہہ سکیں کہ آج بھی اسی ریاست کا قیام ممکن اور ضروری ہے۔ آپ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے کیوں کہ حقیقت یہی ہے کہ جدید ریاست اپنی ساخت، روح اور تصور میں ایک بالکل نئی اور مختلف چیز ہے۔

صحیح اور زیادہ طاقتور مؤقف یہ ہوتا کہ آپ کہتے ہاں جدید ریاست ایک نئی اور اکثر اسلام سے متصادم حقیقت ہے جو قومی عصبیت، سیکولر قانون اور سرمایہ دارانہ منطق پر قائم ہے۔ لہٰذا، ہمیں سرمایہ دارانہ جدید ریاستی ڈھانچہ کو مسترد کر کے اسلامی علمیت کی بنیاد پر حالاتِ حاضرہ کے تحت اپنا ریاستی ڈھانچہ ترتیب دینا چاہیے۔ اس کے برعکس، آپ نے جدید ریاست کے تصور کو ہی اسلامی تاریخ پر منطبق کرنے کی کوشش کی جس سے آپ نہ صرف تاریخی حقائق کو مسخ کرنے پر مجبور ہوئے بلکہ جدید سرمایہ دارانہ ریاست کی اسلام دشمن روح پر پردہ ڈالنے کا سبب بھی بنے۔

سورۃ الانفال کی آیت ۶۰ ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ اور اسلامی ریاست

اس آیت کا حوالہ دے کر آپ یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ چونکہ آیتِ کریمہ میں قوت

کے حصول کا حکم ہے اور قوت کا اعلیٰ ترین مظہر ریاست ہے لہٰذا اس سے ریاست کے قیام کا حکم ثابت ہوتا ہے۔

یہ حکم اس معنی میں ثابت ہوتا ہے کہ آیت کا عمومی حکم بلاشبہ مسلمانوں پر یہ لازم کرتا ہے کہ وہ اجتماعی اور منظم قوت حاصل کریں تاکہ وہ اپنے دین، اپنی جان و مال اور اپنی تہذیب کا دفاع کرسکیں اور اللہ کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھا سکیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک منظم سیاسی اتھارٹی اس قوت کے حصول اور اس کے مؤثر استعمال کا ایک ذریعہ ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ تفسیر بالرائے ہے کہ یہ آیت اس اجتماعی سیاسی تنظیم کو ریاست ہی فرض کرتی ہے یعنی ریاست کی ماہیت اور شکل متعین کرتی ہے۔ یہی ہمارا اور آپ کا اختلاف ہے۔ آپ کا استدلال یہ ہے کہ آیت میں قوت بہم پہنچانے کا حکم ہے اور قوت کا اعلیٰ ترین مظہر یا ذریعہ یا مرکز ریاست ہے لہٰذا آیت میں ریاست کے قیام کا حکم ہے۔ اور یہ آپ کا مضمر اور اصل دعویٰ ہے کہ چونکہ ریاست ایک ہی جیسی حقیقت رہی ہے لہٰذا آج کی جدید قومی ریاست پر قابض ہو کر یا اس جیسی ریاست بنا کر اس حکم پر عمل کیا جائے گا۔ میرے نزدیک، آپ کا یہ دعویٰ ایک خطرناک منطقی چھلانگ ہے۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ "یہ آیت سورۃ الانفال کی ہے جو دو ہجری رمضان غزوہ بدر کے موقعہ پر نازل ہوئی۔ اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ کی امارت حاصل ہو چکی تھی۔ یہود و مسلمان سب ایک معاہدے کے تحت ایک نظم بنا چکے تھے۔ اس لیے سیاسی تنظیم کے قیام کی فرضیت کے حق میں یہ دلیل نہیں ہوسکتی۔ فرض تو پہلے ادا ہو جائے حکمِ فرضیت بعد میں نازل ہو، یہ ممکن نہیں۔ یہ آیت سیاسی تنظیم قائم ہو جانے کے بعد خود کو عسکری طور پر مضبوط کرنے کے حق میں دلیل ہوسکتی ہے۔ فرضیت کے لیے صریح نصِ قطعی ہونا ضروری ہے جس کو دلیل قطعی کہتے ہیں یعنی قطعی الدلالہ نہ کہ استنباط و استدلال سے فرضیت ثابت ہوا کرتی ہے۔ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ، فرائض نصوص صریحہ سے ثابت ہیں۔ ریاست و حکومت کی اگر فرضیت اہل ایمان پر ہے تو نص قطعی ہونی چاہیے نہ کہ کڑی سے کڑی جوڑ کر استدلال کرنے سے فرضیت ثابت ہوتی ہے۔"

میرا استدلال یہ ہے کہ آیت میں قوت کا حکم ہے، اس قوت کو منظم کرنے کے لیے ایک

ایسی اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے جو کفار سے مقابلے کے لیے تیار رہے اور عام مسلمان اس کی اعانت کریں۔ یعنی یہ اتھارٹی مسلمانوں کی حفاظت اور دفاع کے لیے ہوگی نہ کہ اللہ کی مخلوق پر مطلق جبر اور کلی دائرہ اختیار کی دعوے دار ہوگی۔ اس آیت میں "استطاعت" کا لفظ بنیادی اہمیت رکھتا ہے یعنی حسب استطاعت قوت بہم پہنچانے کا حکم ہے، اگر استطاعت نہ ہو تو کوئی پکڑ نہیں۔ یہ اصل میں قوت اور طاقت پر تحدید ہے، لامحدود جبری مظاہرے اور کلی اختیار کی تائید نہیں۔ نیز جیسا کہ اکثر لوگ "رباط الخیل" سے ملٹری ٹیکنالوجی کا حکم ثابت کرتے ہیں انہیں غور کرنا چاہیے کہ یہاں قوۃ اور رباط الخیل الگ الگ ہیں۔ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ٹیکنالوجی ہی قوت ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو استعمار افغانستان سے نہ بھاگتا اور نہ ہی اسرائیل کے مذموم عزائم کی راہ میں کچھ رکاوٹ ہوتی۔ بہرحال، کہنے کی اصل بات یہ ہے کہ اس آیت سے فرض ہونے والی اتھارٹی کی شکل وصورت اور اس کی روح قرآن وسنت سے متعین ہوگی نہ کہ تاریخ کے کسی بھی زمان ومکان میں موجود ریاست کے غالب ماڈل سے۔

اصل نکتہ طاقت نہیں طاقت کا مصرف ہے۔ قرآن صرف طاقت کے حصول کا حکم نہیں دیتا، وہ اس طاقت کے مقاصد اور حدود بھی متعین کرتا ہے۔ جب آپ صرف طاقت کے اعلیٰ ترین مظہر پر توجہ مرکوز کرتے ہیں تو آپ اس کے جوہر اور مقصد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جدید قومی ریاست بلاشبہ طاقت کا ایک بہت بڑا مظہر ہے لیکن اس کی یہ طاقت کس تعقل کی خدمت کرتی ہے؟ اور پھر اگر جدید سرمایہ دارانہ ریاست کا تعقل بدل دینا آپ کے اختیار میں یا ممکن ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ طاقت کا اس سے الگ یا بڑا مظہر قائم کر لیں؟ ریاست ہی سے اتنا عشق آخر کیوں ہے؟ جس ریاست میں قومی مفاد سب سے مقدم ہے آپ اسے استعمال تو کر سکتے ہیں، لیکن وہ ریاست اپنی ساخت میں ہی آپ کے مقصد سے متصادم ہے۔ آیتِ کریمہ سے منظم سیاسی قوت کے قیام کی فرضیت تو ثابت ہوتی ہے لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ وہ قوت جدید ریاست کی شکل میں ہی حاصل کی جائے یا یہ کہ جدید ریاست اور اسلامی خلافت ایک ہی چیز ہیں۔ اس آیت سے ایک اسلامی سیاسی نظم کے قیام کا اشارہ ضرور ملتا ہے لیکن یہ کہنا کہ یہ نظم وہی نظام ہے جسے آج دنیا ریاست کہتی ہے، یہ آیت کے مفہوم پر وہ معنی لادنا ہے جو اس میں موجود نہیں۔

عوامی حاکمیت اور اللہ کی حاکمیت

ایک اسلامی ریاست کے مدعی کا دعویٰ یہی ہے کہ ہم عوامی حاکمیت کے قائل نہیں۔ اس لیے ہم جدید ریاست نہیں بلکہ اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ایک جملہ ریاست کے قدیم ہونے کے حق میں دیے جانے والے تمام دلائل کی عمارت کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔ اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ جدید ریاست اور اسلامی نظامِ حکومت دو جوہری طور پر مختلف حقیقتیں ہیں۔ ان دونوں کے درمیان سب سے بڑا اور ناقابلِ عبور فرق ہی حاکمیت (Sovereignty) کے تصور کا ہے۔ جب عوامی حاکمیت کو رد کر دیا تو تسلیم کر لیا کہ آپ جس نظام کے داعی ہیں وہ اپنی ماہیت اور بنیاد میں جدید ریاست سے یکسر مختلف ہے اور ان دونوں کے درمیان کوئی اصولی تسلسل نہیں بلکہ ایک اصولی انقطاع ہے۔

اس سے ہم فکری نزاع کی انتہائی ضمنی اور سطحی بحث میں داخل ہوتے ہیں کہ اگر اسلامی ریاست جدید ریاست سے جوہری طور پر مختلف ہے تو پھر لفظ ریاست پر اصرار کیوں؟

جب آپ کا مجوزہ نظام جدید ریاست کی بنیادی روح اور خواص کو ہی مسترد کرتا ہے تو پھر آپ اسے اسلامی ریاست کا نام دے کر کیوں خود کو اور دوسروں کو مغالطے میں ڈالتے ہیں؟ یہ لفظ ریاست اپنے اندر قومیت، جغرافیائی حدود، سیکولر قانون اور عوامی حاکمیت کا پورا مغربی فلسفہ سمیٹے ہوئے ہے۔ جب آپ اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں، تو یہ تمام تصورات بن بلائے مہمان کی طرح آپ کی فکر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ خلافت، امامت، امارت، وطن، سرزمین، سلطنت وغیرہ صرف الفاظ نہیں بلکہ مکمل تصورات ہیں۔ جب آپ خلافت کہتے ہیں تو اس میں نیابتِ الٰہی، شریعت کی بالادستی، امت کا تصور اور شوریٰ کا مفہوم خود بخود شامل ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں عوامی حاکمیت نہیں لیکن عوام کی رضامندی اور مشاورت ضرور ہے۔ ہمارے ہاں اس کے لیے بیعت کا تصور ہے۔ بیعت عوام کی طرف سے حاکمِ وقت کے ہاتھ پر اس بات کا عہد ہے کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق حکومت کرے گا اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ یہ حاکم کو مطلق العنان نہیں بناتی بلکہ شریعت کا پابند بناتی ہے۔ یہ عوام کی طرف سے ایک مشروط معاہدہ ہے، حاکمیت کی غیر مشروط منتقلی نہیں۔

اگر بات یہی ہے کہ میں اور آپ جس نظام کے داعی ہیں وہ جدید ریاست نہیں ہے اور اس کی بنیاد حاکمیتِ الٰہی پر ہے نہ کہ عوامی حاکمیت پر۔ تو یہ بحث ہی نہیں ہونی چاہیے کہ ریاست قدیم ہے یا جدید بلکہ اس پر ہونی چاہیے کہ ہمیں متناقض فیہ "اسلامی ریاست" کی جدوجہد کرنی چاہیے یا تاریخی طور پر موجود طرزِ حکومت سے ربط بناتے ہوئے اپنا ڈھانچہ وضع کرنا چاہیے۔

ریاست اور اقامتِ دین

ایک مغالطہ یہ ہے کہ اگر مسلمان جدید اسلامی ریاست نہیں بنائیں گے تو اقامتِ دین اور غلبہ دین کا فریضہ کیسے ادا ہوگا؟

اس سوال میں ایک نہایت لطیف اور خطرناک مغالطہ پوشیدہ ہے۔ یہ سوال اقامتِ دین اور ریاست کے قیام کو اصل میں ایک ہی چیز قرار دیتا ہے یعنی اقامتِ دین کا معنی ہے ریاست قائم کرنا۔ گویا کہ ریاست ہی وہ واحد اور لازمی ظروف ہے جس میں دین کو قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہمیں دو الگ الگ تصورات میں فرق کرنا ہوگا: سیاسی اختیار و اقتدار کا حصول اور جدید قومی ریاست کا ڈھانچہ۔

اس پر کوئی دو رائے نہیں کہ دین کے مکمل نفاذ یعنی اس کے اجتماعی احکام حدود، قصاص، زکوٰۃ کا نظام، جہاد وغیرہ پر عمل درآمد کے لیے سیاسی طاقت اور ایک منظم اجتماعی ہیئت ضروری ہے۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ کیا یہ سیاسی اختیار لازماً دوسری چیز (جدید قومی ریاست) کی شکل میں ہی حاصل کیا جائے؟ سوال میں یہ موقف پنہاں ہے کہ چونکہ آج طاقت کا غالب ڈھانچہ ریاست ہے، لہٰذا ہمیں اسی ڈھانچے کو اپنا کر یا اس پر قبضہ کر کے دین قائم کرنا ہے بلکہ بس ریاست پر قابض ہو جانا ہی دین کا قیام ہے۔ یہ راستہ دین کو قائم کرنے کی بجائے دین کو مسخ کرنے پر منتج ہوگا۔ کیونکہ ریاست جس طرح کہ آج قائم ہوسکتی ہے یا قائم ہے، اپنی اساس، نہاد اور غایت میں اسلام سے متصادم ہے، کچھ جزوی سمجھوتے ضرور ہو سکتے ہیں لیکن اگر یہ سمجھوتے ہی کرنے ہیں تو قوت کے حصول کا فائدہ ہی کیا ہے۔ یہ تو الٹا خطرناک انتخاب ہے کہ پہلے آپ جس بات کے اہل نہ تھے، استطاعت نہ رکھتے تھے اس لیے مکلف نہ تھے۔ پھر

آپ قوی بننے کے چکر میں بزعم خود مکلف بھی بن گئے اور قوت کے حصول کا مقصد بھی ہاتھ نہ آیا۔ اب اس سے یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ تکلیف سے بچنے کے لیے عمل موقوف کرنا جائز نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ آگ کو پانی بنانا ہمارے اوپر فرض نہیں کیوں کہ یہ ممکن ہی نہیں۔ ناممکن کو ممکن بنانے کا مکلف ہونے کا دعویٰ کرنا اپنی جان پر ظلم کرنا ہے۔ مثلاً اقامتِ دین بمعنی ریاست ایک منصوص حکم فرض کرنے سے آپ کو خود مختار ذاتی حاکمیت تسلیم کرنا ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کی حاکمیت کو عوامی حاکمیت میں بدلے بغیر ریاست قائم نہیں ہوسکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ امت کے تصور کو قومی ریاست کے زندان میں قید کیے بغیر ریاست نہیں بنائی جا سکتی۔ تیسری چیز اعلائے کلمۃ اللہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسے اعمال جدید ریاست جائز ہی نہیں سمجھتی، اگر اسے ریاستی شکل دے بھی لیں تو یہ محض ظاہری، سطحی، جبری اور تادیبی چیز ہوگی اور اخلاق اور روحانیت سے بالکل خالی ہوگی۔ چوتھی چیز جوازیت ہے۔ آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ریاست کی اساسی، بدیہی اور مستقل حقیقت اس کی جوازیت ہے اور عوام اسے جائز سمجھتے ہیں۔ کیا متصورہ اسلامی ریاست میں عوام کو یہ اختیار دیا جا سکتا ہے اور اس کا مکلف بنایا جا سکتا ہے؟

اقامتِ دین کا راستہ یہ نہیں کہ اسلام کو جدید ریاست کے سانچے میں ڈھالا جائے بلکہ یہ ہے کہ اسلام کے اپنے سیاسی تصور اور عمل کو از سرِ نو زندہ کیا جائے۔ اس کے لیے دعوت و تبلیغ یہ ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں کے ذہنوں سے جدید ریاست کا بت نکالا جائے۔ اس وہم سے نکالا جائے کہ جدید ریاست ہی تدبیر منزل کی حتمی یا موثر شکل ہے۔ اجتماعی تنظیم کے ذریعے اخلاقی قدریں مسلمانوں کے اندر راسخ کی جائیں۔ یہ ایک تدریجی عمل ہے، انقلابی نہیں۔ ہم یہ خود سے فرض نہیں کر سکتے کہ مسلمان عوام واقعی نفاذِ شریعت کی تمنا رکھتے ہیں اور اس کے نفاذ کی عین وہی شکل اور طریقہ تصور کرتے ہیں جو انقلابیوں کے تصور اور فکر میں موجود ہے۔

لہٰذا، سوال یہ نہیں کہ ریاست کے بغیر دین کیسے قائم ہوگا؟ بلکہ سوال یہ ہونا چاہیے کہ جدید ریاست کے اسلام دشمن ڈھانچے کے ہوتے ہوئے دین پر عمل کیسے کیا جا سکتا ہے؟

اقامتِ دین کے لیے ریاست ناگزیر قرار دینے میں بہت باریک مغالطہ پنہاں ہے جو مسلمان کو ایک دوراہے پر لا کر تذبذب میں ڈال دیتا ہے اور اس کے آگے کعبہ، پیچھے کلیسا ہوتا

ہے۔اس مؤقف میں پہلا مقدمہ یہ ہوتا ہے کہ اقامتِ دین فرض ہے۔دوسرا مقدمہ یہ ہوتا ہے کہ اقامتِ دین کا مطلب حصولِ اقتدار اور قیام ریاست ہے۔لہٰذا نتیجہ یہ بنتا ہے کہ حصولِ اقتدار اور قیام ریاست فرض ہے۔اب پہلے مقدمے پر عمومی طور پر کسی کو اعتراض کی مجال نہیں۔اصل مخمصہ دوسرا مقدمہ ہے اور یہ اصل میں اہل سنت کی فکر و تاریخ کے برخلاف دین کی ایک نئی تعبیر اور تاسیس ہے۔اس سے نہ صرف دین کا مفہوم بدلتا ہے بلکہ تمام اسلامی روایت اپنے فکر و عمل کے ساتھ کٹہرے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔یا تو آپ کو یہ دعویٰ ماننا پڑتا ہے کہ شروع سے آج تک اسلامی ریاست رہی ہے یا یہ دعویٰ ماننا پڑتا ہے کہ دین کا صحیح مفہوم کوئی سمجھ ہی نہ پایا اس لیے سب کے سارے اعمال ردی ہو گئے۔وہ جلیل القدر انبیا علیہم السلام جن کی امت محض ایک امتی پر مشتمل رہی، وہ سب اقامتِ دین کے جدید تصور سے نعوذ باللہ ناکام اور کم فہم بن گئے۔یہ مؤقف غیر تقلیدی تو ہے ہی، اجتہاد نہیں بلکہ اعتزال ہے۔دین کا یہ جدید مفہوم یعنی اقامتِ دین اصل میں حصولِ اقتدار اور قیامِ ریاست کو خلط ملط کر کے تیار کیا گیا ہے جس کا واحد مقصد غیر فطری انسانیت کش ساخت ریاست کو جواز فراہم کرنا اور مسلمانوں کو اس پر قربان کرنا ہے۔اقامتِ دین والا استدلال ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ سفر کرنا سنت ہے۔سفر تو صرف ہوائی جہاز میں بیٹھنے سے ہی ہوتا ہے، لہٰذا ہوائی جہاز میں بیٹھنا سنت ہے۔اقامت دین کا مدعی ایسے ہی استدلال میں مغالطے کا مبالغہ کرتے ہوئے ہوائی جہاز میں بیٹھنا سب پر منصوص طور پر واجب قرار دیتا ہے۔

اصل میں یہ مؤقف کسی بھی مسلمان کے سامنے یوں رکھا جاتا ہے کہ بتاؤ کیا ریاستی اقتدار کے بغیر دین قائم ہوسکتا ہے؟ یہ سوال آگے کنواں پیچھے کھائی کھود دیتا ہے۔ اگر جواب ہاں میں دیا جائے تو دین کے ایک حصہ سے منکر ہونے کا الزام فٹ ہوتا ہے۔اگر کہا جائے کہ نہیں تو کہا جائے گا لیجیے آپ نے خود ہی ریاست کی ناگزیریت تسلیم کر لی۔یہ اصل میں لسانیاتی تماشا ہے۔مثلاً آپ کسی بچے سے پوچھیں کہ "بیٹا کیا نل میں پانی نہیں آ رہا؟" تو اس سوال کا جواب ہاں اور ناں دونوں صورتوں میں ایک ہی رہتا ہے۔نہیں کا مطلب ہوگا نہیں آ رہا، ہاں کا مطلب بھی ہوگا کہ نہیں آ رہا کیونکہ سوال کی ساخت میں آپ نے حقیقتِ واقعہ کی پہلے ہی سے نفی کر کے اسے غیر ضروری طور پر استفہامیہ بنا دیا ہے یا پھر استفہامیہ بنا کر اس کی نفی کر دی

ہے۔ اقامتِ دین کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اقامت دین کا تصور دین اسلام کے اجماعی تصور کی نفی کرنے کے بعد اس انحرافی تعبیر کو درست دین کے طور پر پیش کرتا ہے، سلبی صورت میں دین اسلام کا منکر قرار پاتے ہیں، ایجابی صورت میں دین اسلام نہیں بلکہ انحرافی تعبیر کے مؤید ٹھہرتے ہیں۔ آپ نے گندم خریدنے کا معاہدہ کیا تھا، اب جو ارمل رہا ہے؛ یا تو چپ چاپ لے لو یا پھر معاہدے سے منحرف ہونا قبول کرو۔

ہم کہتے ہیں کہ دین پر عمل سیاسی اقتدار سے پہلے شروع ہو جاتا ہے خواہ غالب سیاسی اقتدار کتنا ہی دشمن کیوں نہ ہو۔ اگر ایک عمل کا آغاز بغیر اقتدار کے ہوسکتا ہے تو اس پر مداومت اور کمال بھی ہوسکتا ہے کیوں کہ آغاز ہی میں تو مصائب اور ضعف ہوتا ہے، ان معنوں میں کہ اجتماعیت ابھی ابتدائی درجے میں ہوتی ہے۔ جب اجتماعیت مضبوط ہوتی ہے اور وسیع ہوتی ہے تو پھر آپ اقتدار پر بھی قابض ہو جاتے ہیں۔ مکی اور مدنی دور سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔ اگر اس کے برعکس مانیں تو لازم آئے گا کہ رسول اللہ ﷺ دین پر عمل نہ کر رہے تھے، نعوذ باللہ من ذلك۔ اگر آپ کہیں کہ نفاذِ دین کے لیے ہی تو ہجرت کی گئی تو پھر آپ ریاست درونِ ریاست کا دعویٰ چھوڑ دیں اور سرمایہ دارانہ قومی ریاست سے ہجرت کر کے کسی دوسرے خطے میں جا کر نفاذِ دین کا کام کریں کیونکہ اگر ریاست درونِ ریاست کی انقلابی جدوجہد ممکن ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جدوجہد مکہ میں رہ کر کیوں نہ کی اور مدینہ کی طرف ہجرت کیوں فرمائی۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ہجرت اللہ کے حکم کے سبب سے کی گئی تو پھر دو باتیں ہیں۔ ہجرت کا حکم آج بھی قرآن کریم میں جاری ہے بلکہ ہجرت نہ کرنے پر باز پرس بھی ہوگی۔ اگر ہجرت کا حکم لاگو نہیں ہوتا تو پھر ریاست درون ریاست قائم کرنے کا حکم ثابت کیا جائے۔ بہر حال، دین پر عمل کرنے اور مسلمان ہونے کا تقاضا پورا کرنے کے لیے اقتدار ضروری ہوتا تو ہر نبی کو پہلے ریاست وحکومت دی جاتی، پھر دعوت وتبلیغ کا حکم ملتا۔ دین پر عمل اقتدار کی راہ ہموار کرسکتا ہے، یہ تو نصوص اور تاریخ سے دکھایا جا سکتا ہے۔ اقتدار پر قبضے سے نفاذ وتعمیلِ دین آسان ہو جاتا ہے، یہ ثابت کرنا مشکل ہے بلکہ اقتدار اور غلبہ ہی مقصود ہے تو اقتدار ملنے پر دین کی کیا ضرورت ہے۔ اقتدار تو آخری شکل ہے اور اللہ کا انعام ہے۔ فرد، خاندان اور معاشرے کو دین کے مطابق ڈھالنا ضروری عمل ہیں اور اس چیز کو اللہ تعالیٰ نے

ریاست کے ساتھ نتھی نہیں کیا۔ اقامت دین ان تینوں ابتدائی درجات کو چھوڑ کر براہ راست چوتھے مقام پر فائز ہونے کی سعی ممکن ہے نہ کہ ضروری۔

اقامتِ دین، دین اسلام کی جدیدیت کاری کس طرح ہے، یہ دیکھنے کے لیے غور کیجیے کہ اسلام کے کتنے فیصد احکام وفرائض کے لیے اقتدار کی ضرورت ہے۔ محض ایک قلیل تناسب ایسا ہے جس کے لیے قوت اور جبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا اقامتِ دین والی تعبیر پر مصر رہنے کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ ہے دوسروں پر جبر کرنے کی خواہش۔ یعنی اقامتِ دین کی آڑ میں درحقیقت عامۃ الناس پر کوڑے برسانے کا جواز ڈھونڈا جا رہا ہے۔ یہ سیاست کو دین بنا لینے اور دین کو محض سیاسی بنانے کا دہرا عمل ہے۔ یہی ارادۂ قوت و جبر نطشے سکھاتا ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اقامت دین سے جس قسم کی ریاست نمودار ہوتی ہے وہ ہر لحاظ سے محترم رضوی بھائی والی محدود ریاست ہی ہے کیونکہ اس ریاست کا مقصد "قوت کا ارتکاز" ہے۔ قوت کا نفاذ اور جبر کا اطلاق محدود ریاست ہی کے ساتھ خاص ہے بلکہ جبر استعمال کرنے ہی کا نام ریاست رہ جاتا ہے۔ اقامتِ دین سے وسیع تر تصورِ ریاست کی تائید نہیں بلکہ نفی ہوتی ہے۔ لیکن متضاد طور پر اسی محدود ریاست کی گرفت اتنی پھیلائی جاتی ہے کہ اس سے کوئی بچ نہیں پاتا کیونکہ وسیع تر تصور کی آڑ میں سب کچھ ریاستی دائرہ کار میں لا کر اسے محدود تصور والے جبری اجارہ دار کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ریاست کے وسیع تر تصور کا مطلب یہ جبر کا دائرہ حتی الامکان وسیع کیا جائے۔

اصولی طور پر رضوی صاحب نے ایک ضمنی سوال کو بنیادی سوال سمجھ کر بحث اٹھائی ہے۔ ریاست کا جدیدیت کی اختراع ہونا یا قدیم ہونا اصل مسئلہ نہیں۔ اصل مسئلہ اقامت دین یعنی اسلام کی ابوالاعلائی تعبیر ہے۔ مولانا مودودی کی یہ تعبیر اصل میں پان اسلام ازم ہی کا اصطلاحی تغیر ہے۔ ریاست کا مسئلہ تو اس تعبیر کے خلاف پیش کیا جانے والا ایک اہم اعتراض ہے، بذاتِ خود مسئلہ نہیں۔ اگر دین اسلام کی وہی تعبیر درست مان لی جائے جو مولانا مودودی نے فرمائی ہے تو پھر ریاست کی قدامت و جدت کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس صورت میں رضوی

بھائی نے جو رائے اسلامی ریاست کے مخالفین کے لیے دی ہے وہ محض ریاست پر بحث کرنے والوں پر نہیں بلکہ دین کی روایتی تعبیر تسلیم کرنے والے اہل السنت والجماعت کے جمہور کے خلاف ہے۔

آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ رضوی صاحب نے ایک ثانوی اور ضمنی سوال اٹھا کر جو بحث فرمائی ہے، وہ اس ضمنی دائرے میں بھی کوئی قابل ذکر تاثر پیدا نہیں کرتی۔ مثلاً

۱۔ مضمون میں ریاست کا تصور اس قدر وسیع کر دیا گیا ہے کہ یہی وسعت اسے بے معنی بنا دیتی ہے۔ اس کی وسعت اس کا تجزیاتی زور فنا کر دیتی ہے اور یہی رضوی صاحب کے مقدمے کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

۲۔ ریاست کا وسیع تر تصور اور ریاستی تعقل دونوں بالترتیب گرامشی اور فوکو کے ہیں۔ انہوں نے یہ تصورات جدید سرمایہ دارانہ ریاست کی منفرد نوعیت اور اس کے جبر کے نئے طریقے بے نقاب کرنے کے لیے استعمال کیے تھے۔ اس کے برعکس، رضوی صاحب نے انہی تصورات کو یہ ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا کہ ایسی ریاست تو ہمیشہ سے موجود تھی۔

۳۔ مضمون میں حکومت و ریاست یا حکمران اور ریاست کے فرق کا دعویٰ کیا گیا ہے لیکن یہ فرق قدیم و جدید ریاستوں میں رضوی صاحب کے دعووں کا ساتھ نہیں دیتا۔

۴۔ آپ نے لبرل ریاست کے اپنی کلیت کے اندر آزادی دینے کے عمل کو اسلام کے کلی نظام میں اجتہاد کی آزادی پر قیاس کیا ہے۔ یہ ایک فاسد قیاس ہے۔ دونوں آزادیوں کی بنیاد، مقصد اور نوعیت بالکل مختلف ہے۔ ورنہ استدلال کا یہ لازمی منطقی نتیجہ ماننا پڑے گا کہ لبرل ازم میں محدود اسلام موجود ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

تعلیم و تربیت مدیر

اسلام کی جنسی تعلیمات

مجوزہ نصاب برائے طالبات کلاس نہم و دہم

یہ کورس اسلامیات کی استاد پڑھائیں گی

یہ تمام تعلیمات قرآن وسنت اور کتب فقہ میں تفصیلاً موجود ہیں لہٰذا نہم دہم کی مسلم طالبات کو پڑھائی جانی چاہئیں تاکہ ان پر اسلام کی آفاقیت آشکار ہو نیز عملی زندگی میں حقوق وفرائض کی ادائی میں سہولت رہے اور وہ غیر اسلامی معلومات سے گمراہ نہ ہوں۔

خواتین سے متعلق دینی لٹریچر جیسے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی 'بہشتی زیور'، مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کی 'خواتین کے دینی مسائل اور ان کا حل'، شیخ صالح بن فوزان الفوزان کی کتاب 'خواتین کے مخصوص مسائل'، (اُردو ترجمہ) اور 'خواتین کے اہم وجدید شرعی مسائل' از محمد احسن اویسی وغیرہ میں موجود ہے۔ اہل علم سے تبصرے اور حک واضافے کی درخواست ہے۔

مقدمہ

فصل اوّل: اسلام کی جنسی تعلیمات

اسلام ساری زندگی بشمول جنسی امور کے لیے ہدایات دیتا ہے جن پر عمل کرنا مسلمانوں پر واجب ہے جیسے شرم وحیاء، عفت، عورتوں کا پردہ کرنا، مردوں اور عورتوں کو غضِ بصر کا حکم، نکاح وطلاق، حیض ونفاس اور وراثت وغیرہ کے احکام۔

فصل دوم: مغرب کی جنسی تعلیمات

مغرب کی جنسی تعلیمات خلاف اسلام ہیں لہٰذا ان کا ترک شرعاً واجب ہے اور ان پر عمل معصیت ہے جیسے نکاح کے بغیر جنسی تعلق کا قانونی ہونا: شراب نوشی ہم جنس شادیوں کی اجازت، ہر قسم کے لباس کی آزادی، عورت کا مساوی حقِ طلاق وغیرہ۔ ہندو تہذیب کی کئی روایات جو ہمارے ہاں شادی بیاہ میں مروج ہیں، وہ بھی غیر اسلامی ہیں۔

فصل سوم: نکاح

نکاح کی اہمیت، جو نہ کر سکے اس کے لیے احکام۔ نکاح کی ترجیحات، منگنی، نکاح میں

جلدی کرنا (تاخیر کی غیر شرعی وجوہات) نکاح کی عمر کا مسئلہ، نکاح کی شرعی رسوم (محرم رشتے، سادگی، حق مہر، ولیمہ، کفو، جہیز بذمہ دولہا، وطی کے شرعی اسالیب، احتلام وغیرہ)۔ نکاح کی غیر شرعی رسوم (گھر سے بھاگ کر نکاح کرنا [ولی کی شرعی حیثیت]۔ جہیز بذمہ لڑکی کے والدین، کورٹ میرج، قرآن سے نکاح، نکاحِ شغار [وٹّا سٹّا] ونی کرنا۔ وطی کے غیر شرعی طریقے، منگنی کے ذریعے فلرٹ کرنا۔ فون پر شادی، جلق، سحاق (عورت کے عورت سے جنسی تعلقات)۔ خاوند کے حقوق وفرائض۔ بیوی کے حقوق وفرائض۔ اولاد کے حقوق وفرائض وغیرہ)۔

فصل چہارم: طلاق

طلاق دینے کا شرعی طریقہ۔ طلاق دینے کے غلط طریقے۔ شرعی قوانین اور ملکی قوانین میں تضاد۔ خلع کا شرعی طریقہ۔ خلع کے موجودہ قوانین کا غلط استعمال۔

فصل پنجم: حیض

تعریف۔ احکام ومسائل

فصل ششم: نفاس

تعریف۔ احکام ومسائل

فصل ہفتم: وراثت کے احکام

عورتوں کا وراثت میں حصہ۔ عورتوں کو وراثت میں حق نہ دینے کی قبیح رسم۔ عورتوں کی ملازمت اور کاروبار کے مسائل وغیرہ۔

فصل ہشتم: معاشرے کی غیر شرعی سماجی وجنسی رسوم

جوائنٹ فیملی سسٹم۔ مردوں کا مردوں سے اور عورتوں کا عورتوں سے جنسی تمتع۔ بیوہ اور مطلقہ کا دوسری شادی کو برا سمجھنا۔ حلالہ۔ عورتوں کو وراثت میں حصہ نہ دینا۔ خنثیٰ اور ٹرانس جینڈر۔ استمنا بالید۔ جنسی بگاڑ کے عوامل: میڈیا [سوشل، الیکٹرانک اور پرنٹ] تعلیم خصوصاً مخلوط تعلیم۔ مخلوط پارٹیاں۔ غیر اسلامی ماحول ومعاشرت)۔ بے اولاد جوڑے کا اولاد لینا (جائز اور ناجائز طریقے)۔

تعلیم و تربیت

ادارہ

مقابلے (CSS) کے موجودہ امتحانات ختم کر دیئے جائیں

جس انگریز نے یہ امتحان شروع کیا تھا اس نے انگلینڈ میں یہ بند کر دیا ہے کہ اس میں سقم موجود ہیں اور یہ سسٹم کو بہتر بنانے کی بجائے جمود کا شکار کر رہا ہے۔ امریکا، یورپ وغیرہ کسی ترقی یافتہ ملک میں ایسا مضحکہ خیز امتحان نہیں ہوتا۔

پاکستان بننے سے پہلے اسکا نام ICS یعنی انڈین سول سروس تھا۔ پھر پاکستان میں اس کے نام کو 'سینٹرل سپیریر سروس' رکھا گیا یعنی تکبر بھرے لفظ superior کا اضافہ کیا گیا۔

بظاہر اس میں پاکستان کے best brains چنے جاتے ہیں۔ لیکن پھر جب وہ best brain سروس میں آتے ہیں تو جن محکموں کو وہ چلاتے ہیں ان کی کارکردگی بدترین ہوتی ہے۔ اگر دیکھا جائے کہ پاکستان میں بدترین محکمے کون سے ہیں جیسے پولیس، کچہری، کسٹمز، انکم ٹیکس، AG آفس، ریلوے۔ تو پتا چلتا ہے کہ یہ سارے محکمے CSS افسروں کے ماتحت ہیں۔

آخر کیا وجہ ہے کہ best brain کی قابلیت کا بالکل بھی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

پروفیسر آف انگلش رانا جہانگیر جن کے بہت سے شاگرد CSS افسر ہیں، کہتے ہیں کہ اگر CSS کی نوکری میں کرپشن نہ ہو تو پھر تو یہ امتحان کوئی دے گا ہی نہیں۔

پھر ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایک بی اے پاس لونڈا یا چھوکری تاریخ، جغرافیہ، مطالعہ پاکستان، اسلامیات اور انگلش میں CSS پاس کرنے والے کو پہلے اسسٹنٹ کمشنر اور اس کے بعد ڈپٹی سیکریٹری ہیلتھ لگا دیا جاتا ہے۔ پھر لائیو سٹاک کا ایم ڈی اور پھر واسا کا ایم ڈی لگا دیا جاتا ہے۔ اور اس بیچارے کو ان میں سے کسی محکمے کے بارے کچھ بھی پتا نہیں ہوتا۔

کیا اس امتحان کا طریق کار جو ڈیڑھ سو سال پرانا ہے اسے بدلنا نہیں چاہیے؟ بہتر نہ ہوگا کہ ہر محکمے کا الگ CSS امتحان ہو۔ مثلاً سیکریٹری ہیلتھ کے لیے MBBS ہونا ضروری ہو۔ اریگیشن کے لیے انجینئرنگ ضروری ہو اور AG آفس کا CSS کرنے کے لیے اکاؤنٹس کی ڈگری لازمی ہو۔

تعلیم و تحقیق

ڈاکٹر محمد ارشد [۱]

پاکستانی یونیورسٹیوں میں تحقیق کا المیہ

چار چار، پانچ پانچ، چھ چھ سورماؤں کا متحد و یکجا ہو کر مقالہ نگاری کرنا

آج معروف جرمن مستشرق این میری شمل پر اُردو و انگریزی میں لکھے گئے متعدد مقالات جو لا ہوتی تحقیقی مجلّات میں شائع ہوئے ہیں، دیکھنے کا موقع ملا۔ ان مقالات کے لکھنے والوں میں سرکاری یونیورسٹیوں میں اسلامیات کے محکموں میں براجمان پروفیسرز (ڈین وڈائریکٹر حضرات) بھی شامل ہیں۔ مقالات کیا ہیں خرافات کے مجموعے ہیں اور لکھنے والوں کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

یا للعجب! علوم اسلامیہ، اُردو ادبیات اور تاریخ جیسے موضوعات پر چار چار، پانچ پانچ، چھ چھ سورمے (جن میں ایک آدھ نامی گرامی پروفیسر [بلحاظ عہدہ ڈائریکٹر اور ڈین وغیرہ] بھی شریک مصنف کے طور پر شامل ہوتا ہے) مل کر ایک مقالہ لکھ رہے ہیں مگر بدقسمتی سے بات بنائے نہیں بنتی۔ ان سورماؤں کی انگریزی تو انگریزی (کہ وہ ایک اجنبی زبان ہے) اُردو کی استعداد بھی قابل ملامت ہے۔ اب ان سورماؤں سے کوئی یہ پوچھے کہ جب تم اُردو تک میں اپنے خیالات کو بیان کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو تو ایک اجنبی زبان میں زور آزمائی کی کیا ضرورت ہے؟

اصل میں یہ سورمے تحقیق کا حق نہیں ادا کر رہے بلکہ تحقیق کی میت کو کندھا دینے اور اسے گہری قبر میں اتارنے کا دینی و ملی فریضہ بطریق احسن انجام دے رہے ہیں۔ ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ ایسے واٹس ایپ گروپ موجود ہیں جو علی الاعلان پیسے لے کر تھیسز اور ریسرچ آرٹیکل لکھتے ہیں اور ایسے واٹس ایپ گروپ بھی موجود ہیں جو علی الاعلان پیسے لے کر کسی ریسرچ آرٹیکل میں پہلے، دوسرے یا تیسرے مصنف کے طور پر شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ پتا نہیں ہائر ایجوکیشن کمیشن کب اس صورتِ حال کے تدارک کا سوچے گا؟

---

[۱] پروفیسر (ر) علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

تعلیم و تربیت حافظ محمد عمران طحاوی

علما اور ائمہ مساجد کی تنخواہیں کم کیوں؟

تاریخی، معاشی اور فکری تناظر میں ایک جائزہ

اسلامی تاریخ میں علمائے کرام اور ائمہ مساجد کو ہمیشہ دین کے ستون، فکری قیادت کے علمبردار اور عوام کے رہنما مانا گیا ہے۔ تاہم، ایک حیران کن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں انہی علما و ائمہ کو مالی اعتبار سے کمزور یا محروم رکھا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے: ﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿18﴾﴾ [التوبہ ۹:۱۸]

’’اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت پر ایمان لاتے، نماز قائم رکھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو قریب ہے کہ یہ لوگ ہدایت پانے والوں میں سے ہوں۔‘‘

مسجد کی آبادکاری میں سب سے بڑا کردار امام مسجد کا ہے اور امامت ایسا عظیم منصب ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اولیائے عظام اور علمائے کرام نے امامت فرمائی۔ حدیث مبارکہ میں فرمایا: ”ثلاثة على كثبانِ من المسك يوم القيامة وذكر انّ منهم رجلا ام قومًا وهم به راضون۔“[۱]

’’روزِ قیامت تین قسم کے آدمی کستوری کے ٹیلوں پر ہوں گے ان میں سے ایک وہ شخص ہوگا جس نے قوم کی امامت کی اور وہ اس (امام) سے خوش تھے)‘‘۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام کے لیے دعا فرمائی ”الإمام ضامن والمؤذن مؤتمن، اللّٰهم ارشد الائمة واغفر للمؤذنين“[۲]

---

[۱] سنن ترمذی، رقم الحدیث: ۱۹۸۶

[۲] سنن ترمذی، رقم الحدیث: ۲۰۷

''امام ضامن ہے اور مؤذن امین ہے، اے اللہ! تو اماموں کو راہِ راست پر رکھ اور مؤذنوں کی مغفرت فرما۔''

اس سے امام مسجد کی اہمیت اور مقام و مرتبہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن فی زمانہ ائمہ وعلماء کی تعظیم و توقیر کی بجائے انہیں ایک ملازم کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے اور انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ حالانکہ ملازمت کی جہاں ذمہ داریاں ہیں وہیں ان کے حقوق بھی طے ہونے چاہئیں مگر آئمہ مساجد کو کسی قسم کے ملازمانہ حقوق میسر نہیں ہوتے۔ نہ ہفتہ وار چھٹی، نہ سالانہ چھٹیاں اور نہ ہی کوئی سالانہ بونس وغیرہ۔

امام مسجد اپنے علاقے کا وہ معزز شخص ہوتا ہے جس کی اقتدا میں ہر بڑے سے بڑا عہدے والا بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے اور امام کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنا ضامن تسلیم کرتا ہے۔ یعنی اگر امام کی نماز نہ ہو تو مقتدی کی بھی نہیں ہوتی۔ امامت کا منصب کوئی عام منصب نہیں یہ وہ خاص و اعلیٰ منصب ہے جس پر انبیاء کرامؑ اور اصحاب رسول واہل بیت اطہارؓ فائز رہے۔ اور شب معراج نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام انبیاء کرامؑ کی امامت کرائی۔ اس منصب کا حق ادا کرنا بہت ضروری ہے اور امام مسجد کو سنتوں کا ایسا عامل ہونا چاہیے کہ عوام امام کو دیکھ کر سنتوں کے عامل بن جائیں۔ لیکن یہ تمام تقاضے تب ہی پورے ہوتے ہیں جب آئمہ مساجد کو فکر معاش کی تنگی دامن گیر نہ ہو۔ یہ مضمون اس سوال کا تجزیہ پیش کرتا ہے کہ علماء اور ائمہ مساجد کی تنخواہیں عموماً کم کیوں ہوتی ہیں؟

۱۔ قرونِ اولیٰ میں علما کی مالی حالت

دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلافتِ راشدہ

علما اور ائمہ مسجد، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدین کے دور میں تنخواہ لینے کی بجائے رضا کارانہ طور پر دینی خدمات انجام دیتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بننے کے بعد بیت المال سے وظیفہ لیتے رہے۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال سے گھر کے اخراجات کے لیے وظیفہ لیا۔ اس دور کا فکری اصول یہ تھا کہ علم دین اللہ کے لیے ہے، اس پر دنیا نہ کمائی جائے تاہم دینی امور کی بجا آوری میں فکری معاش آڑے

نہ آئے۔ اس لیے اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں آنے والی آمدن سے حضرت عمرؓ نے بدری صحابہ کے وظیفے مقرر کیے جو ۵۰۰۰ درہم سالانہ تھے۔

۲۔ خلافتِ بنوامیہ وعباسیہ میں

علماء وائمہ کو بیت المال سے باقاعدہ تنخواہیں دی جانے لگیں۔ مشہور محدثین جیسے امام ابو یوسف کو قاضی القضاۃ کے عہدے ملے اور مناسب مشاہرہ بھی۔ بنوعباس کے دور میں بعض علما کو ماہانہ 500–300 درہم تک دیے جاتے تھے لیکن بہت سے علما جیسے امام ابوحنیفہؒ نے سرکاری ملازمت اور تنخواہ لینے سے انکار کیا اور کاروبار سے اپنے اخراجات پورے کرتے تھے۔

۳۔ سلطنتِ عثمانیہ اور مغل دور

عثمانی خلافت میں دیانت (Diyanet) نامی ادارے کے تحت تمام ائمہ وخطبا کی باقاعدہ تنخواہیں تھیں۔ مغلیہ دور میں علمائے کرام کو ریاستی وظائف، زمینیں (جاگیریں) اور قضا کے عہدے دیے جاتے تھے لیکن بعض علماء نے وظیفہ لینے کو اخلاص کے خلاف سمجھا اور علمی خدمت کو ''کارِ آخرت'' سمجھ کر بغیر معاوضہ سرانجام دیا۔

۴۔ نوآبادیاتی دور: علما کے معاشی زوال کا آغاز

انگریزوں نے مدارس، اوقاف اور دینی عدلیہ کو سرکاری نظام سے خارج کر دیا اور علما کی تنخواہیں چندے، خیرات، اور وقف پر منحصر ہو گئیں۔ مساجد اور مدارس مستقل ذریعۂ آمدن نہ ہونے کی وجہ سے مالی بحران کا شکار ہو گئے۔ نتیجہ: علما کی ماہانہ تنخواہیں 25–5 روپے تک محدود ہو گئیں (1920s–30s)۔

تاہم یہ تنخواہیں بھی اس دور کے حساب سے مناسب تھیں مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صاحب کو 75 روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی جس میں سے وہ 25 روپے دارالعلوم دیوبند کو واپس کر دیتے تھے۔ اسی طرح مولانا اشرف علی تھانویؒ کو 50 روپے ماہوار ملتے تھے۔ 10 ماہ بعد 500 روپے جمع ہو گئے تو بولے مجھ پر حج فرض ہو گیا ہے گویا دس ماہ کی تنخواہ سے حج کیا جا سکتا تھا۔ یاد رہے کہ اُس دور میں سونا 50 روپے فی تولہ کے حساب سے

خریدا بیچا جاتا تھا جبکہ آج سونے کی قیمت تین لاکھ ستر ہزار روپے ہے تو کیا کہیں پر بھی علماء کی یہ تنخواہ ہے؟ مولانا منظور نعمانیؒ نے 1960ء میں جب حج کیا تو ان کی تنخواہ 250 روپے تھی اور 6 ماہ کی تنخواہ میں حج کے اخراجات 1500 روپے اکٹھے کر لیے۔ ان اعداد و شمار سے معقول تنخواہوں کا حساب لگایا جا سکتا ہے۔

۵۔ برصغیر میں آزادی کے بعد صورتِ حال

پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش: دینی مدارس اور مساجد زیادہ تر نجی نظام میں رہیں۔

امام و مدرس کی تنخواہیں آج بھی:

پاکستان میں: 10,000–25,000 روپے

بھارت میں: 5,000–10,000 روپے

بنگلہ دیش میں: 5,000–10,000 ٹکے

جو ایک محنت کش مزدور کے برابر یا اُس سے بھی کم ہیں

حالانکہ پاکستان میں ایک غیر تربیت یافتہ فرد کی کم از کم ماہوار تنخواہ 37,000 محض آٹھ گھنٹے کام کرنے پر ہے جبکہ ائمہ مساجد 24 گھنٹے کے پابند مزدور ہیں مگر ان کی ماہوار تنخواہ بہت کم رکھی جاتی ہے۔ انہیں کہیں دوسری جاب کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی۔ دیہات میں آئمہ مساجد کے اس سے بھی بُرے حالات ہیں۔

۶۔ تنخواہیں کم کیوں ہیں؟ (تجزیاتی نکات)

i۔ خدمتِ دین کو ''کارِ اخلاص'' سمجھا گیا مگر یہ اخلاص خالی پیٹ کب تک چل سکتا ہے؟ چنانچہ بابا فرید گنج شکرؒ کہتے ہیں ۔

پنج رکن اسلام دے تو چھیواں فریدا ٹک
جے نا ہووے چھیواں تے پنجے سی جانے مک

یعنی اسلام کے پانچ ارکان ہیں تو چھٹا رکن روٹی ہے۔ اگر یہ چھٹا رکن نہ ہو تو پہلے پانچوں پر عمل بھی محال ہو جاتا ہے۔

ii۔ ریاستی عدم سرپرستی

جدید مسلم ریاستوں نے علما کو تعلیم، عدلیہ، اور میڈیا سے باہر رکھا ہوا ہے۔ علماء و آئمہ کے استحصال میں مساجد انتظامیہ بھی ذمہ دار ہے۔ اکثر کمیٹی ممبران مساجد کی زیب و زینت پر تو پیسے لگانے کو تیار رہتے ہیں مگر ائمہ کے معاشی استحصال سے باز نہیں آتے۔

سعودی عرب، ایران، ترکی جیسے چند ممالک کو چھوڑ کر، اکثر مسلم ممالک خصوصاً پاکستان میں دینی خدمات پر باقاعدہ ریاستی بجٹ نہیں رکھا جاتا۔

iii۔ وقف اور عطیات کا انحطاط

ماضی میں مدارس، مساجد اور علما کے لیے وقف زمینیں اور اوقاف کی آمدنی ہوتی تھی جو اب باقی نہیں رہی۔

iv۔ معاشرتی ترجیحات کا بدلنا

معاشرہ دینی طبقے کو عزت تو دیتا ہے مگر جائز معاوضہ نہیں۔ والدین اپنے بچے کو ڈاکٹر و انجینئر بنانے کے لیے خوب پیسے خرچ کرتے ہیں، مگر قرآن و نماز پڑھانے والے امام کے لیے ''چندہ''۔ یہ دہرا کردار مغرب کا عطا کردہ ہے۔

۷۔ حل اور تجاویز

۔ ریاستی سطح پر ائمہ اور مدرسین کا سیلری اسٹرکچر قائم کیا جائے (جیسے ترکی و سعودی عرب میں ہے)۔

۔ وقف نظام کو جدید بنیادوں پر بحال کیا جائے۔ علمائے کرام کی تربیت اور صلاحیت کو وسیع تر کیا جائے تاکہ وہ معاشرتی تبدیلی کے محرک بنیں۔

۔ قوم اور امت کو دینی خدمات کے مالی پہلو کا شعور دیا جائے۔

امام غزالیؒ نے فرمایا: اگر دین کو دنیا کا محتاج بنا دیا جائے تو نہ دین بچے گا، نہ دنیا۔ علمائے کرام اور ائمہ مساجد کا وقار صرف خطبہ اور درس تک محدود نہ ہو، بلکہ انہیں معاشی تحفظ، ادارہ جاتی سہارے، اور عزتِ نفس کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق بھی دیا جائے۔

تزکیۂ نفس ادارہ

قتیلِ محبت

مرزا مظہر جانِ جاناں (متوفی ۱۷۸۱ء) دہلی کے مشہور صوفی تھے۔ وہ اکثر ایک جملہ کہا کرتے تھے کہ ''ہم سے تو دھوبی کا بیٹا ہی خوش نصیب نکلا۔ہم سے تو اتنا بھی نہ ہوسکا''، پھر غش کھا جاتے۔ایک دن ان کے مریدوں نے پوچھ لیا کہ حضرت یہ دھوبی کے بیٹے والا کیا ماجرا ہے؟

انہوں نے کہا ایک دھوبی کے پاس محل سے کپڑے دھلنے آیا کرتے تھے اور وہ میاں بیوی کپڑے دھوکر استری کر کے واپس محل پہنچا دیا کرتے تھے۔ان کا ایک بیٹا بھی تھا جو جوان ہوا تو کپڑے دھونے میں والدین کا ہاتھ بٹانے لگا۔کپڑوں میں شہزادی کے کپڑے بھی تھے۔جن کو دھوتے دھوتے وہ شہزادی کے نادیدہ عشق میں مبتلا ہوگیا۔محبت کے اس جذبے کے جاگ جانے کے بعد اس کے اطوار تبدیل ہوگئے۔ وہ شہزادی کے کپڑے الگ کرتا، انہیں خوب اچھی طرح دھوتا، انہیں استری کرنے کے بعد ایک خاص نرالے انداز میں تہہ کر کے رکھتا، سلسلہ چلتا رہا۔آخر والدہ نے اس تبدیلی کو نوٹ کیا اور دھوبی کے کان میں کھسر پھسر کی کہ یہ تو لگتا ہے سارے خاندان کو مروائے گا، یہ تو شہزادی کے عشق میں مبتلا ہوگیا ہے۔ والد نے بیٹے کے کپڑے دھونے پر پابندی لگا دی۔اُدھر جب تک لڑکا محبت کے زیرِ اثر محبوب کی کوئی خدمت بجا لاتا تھا، محبت کا بخار نکلتا رہتا تھا، مگر جب وہ اس خدمت سے ہٹایا گیا تو لڑکا بیمار پڑ گیا اور چند دن کے بعد فوت ہوگیا۔

ادھر کپڑوں کی دھلائی اور تہہ بندی کا انداز بدلا تو شہزادی نے دھوبن کو بلا بھیجا اور اس سے پوچھا کہ میرے کپڑے کون دھوتا ہے؟ دھوبن نے جواب دیا کہ شہزادی عالیہ مَیں دھوتی ہوں۔شہزادی نے پوچھا کہ پہلے کون دھوتا تھا؟ دھوبن نے کہا کہ مَیں دھوتی تھی۔شہزادی نے اسے کہا کہ یہ کپڑا تہہ کرو۔ اب دھوبن سے ویسے تہہ نہیں ہوا۔شہزادی نے اسے ڈانٹا کہ تم جھوٹ بولتی ہو، سچ سچ بتاؤ ورنہ سزا ملے گی۔ دھوبن کے سامنے سچ بولنے کے سوا کوئی چارا نہ رہا۔دوسرے کچھ دل بھی غم سے بھرا ہوا تھا، وہ زار وقطار رونے لگ گئی اور سارا ماجرا شہزادی

سے کہہ سنایا، شہزادی یہ سب کچھ سن کر سناٹے میں آ گئی۔

اس نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا اور شاہی بگھی میں سوار ہو کر پھولوں کا ٹوکرا بھر کر لے گئی اور مقتولِ محبت کی قبر پر پھول چڑھائے۔ پھر زندگی بھر اس کا یہ معمول رہا کہ وہ اس دھوبی لڑکے کی برسی پر اس کی قبر پر پھول چڑھانے ضرور جاتی۔

یہ بات سنانے کے بعد مرزا صاحب کہتے: اگر ایک انسان سے بِن دیکھے محبت ہو سکتی ہے تو بھلا اللہ سے بِن دیکھے محبت کیوں نہیں ہو سکتی؟ ایک انسان سے محبت اگر انسان کے مزاج میں تبدیلی لا سکتی ہے اور وہ اپنی پوری صلاحیت اور محبت اس کے کپڑے دھونے میں بروئے کار لا سکتا ہے تو کیا ہم لوگ اللہ سے اپنی محبت کو اس کی نماز پڑھنے میں اسی طرح دل و جان سے نہیں استعمال کر سکتے؟ مگر ہم بوجھ اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر شہزادی محبت سے تہہ شدہ کپڑوں کے انداز کو پہچان سکتی ہے تو کیا رب کریم بھی محبت سے پڑھی گئی نماز اور پیچھا چھڑانے والی نماز کو سمجھنے سے عاجز ہے؟

پھر کہتے وہ دھوبی کا لڑکا اس وجہ سے کامیاب ہے کہ اس کی محبت کو قبول کر لیا گیا جب کہ ہمارے انجام کا کوئی پتا نہیں۔ قبول ہوگی یا منہ پر ماردی جائے گی۔ اللہ جس طرح ایمان اور نماز روزے کا مطالبہ کرتا ہے اسی طرح محبت کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ یہ مستحب نہیں فرض ہے، مگر ہم غافل ہیں۔

پھر کہتے اللہ کی قسم! اگر یہ نمازیں نہ ہوتیں تو اللہ سے محبت کرنے والوں کے دل اسی طرح پھٹ جاتے جس طرح دھوبی لڑکے کا دل پھٹ گیا تھا۔ یہ ساری ساری رات کی نماز ایسے ہی نہیں پڑھی جاتی۔ کوئی جذبہ کھڑا رکھتا ہے۔ کہتے یہ نسخہ اللہ پاک نے اپنے نبی کے دل کی حالت دیکھ کر دیا تھا کہ آپ نماز پڑھا کیجیے اور رات بھر ہماری باتیں دہراتے رہا کیجیے، آرام ملتا رہے گا۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے" [۱] اور جب نماز کا وقت ہوتا تو بلال رضی اللہ عنہ کو نماز کے لیے اذان دینے کا حکم دیتے کہ "ارحنا بھا یا بلال" [۲] کہ نماز کے لیے اذان دے کر ہمیں راحت بہم پہنچاؤ۔

---

[۱] سنن النسائی، رقم الحدیث: ۳۹۵۰

[۲] سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۴۹۸

میڈیا حافظ محمد عمران طحاوی

سوشل میڈیا سے اَن سوشل ہوتے لوگ

جب سے دنیا گلوبل ویلج بنی ہے تب سے ایک نیا میڈیا معرض وجود میں آیا ہے یعنی سوشل میڈیا۔ اس میڈیا کے بہت سے فوائد بھی ہیں۔ یہ دنیا بھر کے لوگوں کو آپس میں جوڑنے کا ذریعہ ہے۔ آپ اپنے عزیز واقارب دوست احباب سے کسی بھی وقت رابطے میں رہ سکتے ہیں چاہے وہ دنیا کے کسی بھی ملک میں آباد ہوں۔ مگر سوشل میڈیا کے عطا کردہ تنوع نے ہمیں اپنے ساتھ ایسا چمٹا لیا ہے کہ ہم اس کے فسوں سے باہر نہیں آپاتے۔ وقت کے ضیاع کے ساتھ ہم ان سوشل (unsocial) ہوتے چلے جارہے ہیں۔ یہ آپ کو selfish بناتا ہے۔ سیلفی کا خبط اس کی واضح دلیل ہے۔ طبع انسانی پر اس کے منفی اثرات خصوصاً اس کی لت (addiction) دیکھتے ہوئے ہمیں قرآن حکیم کی یہ آیت یاد آرہی ہے۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ﴾ [البقرہ ۲:۲۱۹]

''یہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں ان سے کہو کہ ان دونوں میں نقصان زیادہ ہے اگرچہ کچھ نفع بھی ہے انسانوں کا مگر ان دونوں کا نقصان ان کے منافع سے زیادہ ہے۔''

اس آیت میں شراب اور جوئے کا ذکر ہے۔ شراب کا نشہ بھی لگ جاتا ہے اور جوئے کی لَت (addiction) بھی پڑ جاتی ہے۔ شراب میں یہ خرابی ہے کہ یہ اپنے گردوپیش سے غافل کردیتی ہے اور جوا انسان میں خودغرضی پیدا کرتا ہے اور دوسروں کے اجڑ جانے سے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔ انسان جسے اُنس ومحبت سے تخلیق کیا گیا ہے یہی وصف اسے دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اگر یہی نہ رہے تو دولت کا فائدہ؟ حضرتِ انسان جو خدا کا خلیفہ ہے، اگر مہر ومحبت سے خالی ہے تو کیا گل کھلائے گا۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

یہی حال سوشل میڈیا کا ہے۔ اس کی بھی لت لگ جاتی ہے۔ سکرین اپنے نشے میں گرفتار کر لیتی ہے۔ آپ کسی موضوع پر کچھ دیکھیں۔ سکرین کا ذوق آپ کو لامتناہی دنیا میں لے جاتا ہے۔ آپ کا انتخاب اسے addiction بنا دیتا ہے۔

آپ بنظرِ غائر ملاحظہ فرمائیں کہ ہر گھر میں آج مسائل کی وجہ یہ سوشل میڈیا کا بڑھتا رجحان ہے۔ بیوی شاکی ہے کہ میاں صاحب اب مجھ پر توجہ نہیں دیتے۔ بچوں کے ہاتھوں میں بھی موبائل ہیں۔ بھائی بھائی سے دور ہے۔ ماں باپ سے تبادلۂ خیال تو کب کا قصۂ پارینہ بن چکا۔ ڈائننگ ٹیبل پر بھی لوگ اس سمارٹ فون کو نہیں چھوڑتے۔ یوں سوشل میڈیا ہمیں اَن سوشل کر رہا ہے۔ مشینوں کی حکومت کا جو رونا اقبال نے رویا تھا اس کی حقیقی اور مکمل تصویر سمارٹ فون ہے۔ یہ دِکھنے میں تو سمارٹ ہے ہی مگر مغرب کی تہذیب میں جہاں ہر ایک کو اپنی پڑی ہوتی ہے، کوئی فیملی سسٹم نہیں، مذہب کو دیس نکالا دے دیا گیا ہے۔ اس مغربی تہذیب کی عملداری میں سمارٹ فون اپنا سمارٹ کردار بڑی دیدہ دلیری اور ہوشیاری سے ادا کر رہا ہے۔

درسگاہوں اور تعلیمی مراکز میں دورانِ تدریس طلبہ اور اساتذہ دونوں کو موبائل استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے لیے وہاں سگنلز منقطع کرنے والے (jammers) لگائے جا سکتے ہیں۔

گھر آ جانے پر اخلاقی طور پر موبائل بند کر دیا جائے تا کہ بڑے چھوٹے ایک دوسرے سے مکالمہ کر سکیں۔

بچوں کو مخربِ اخلاق ویڈیو گیمز سے بچانے کے لیے انہیں پابند کیا جائے کہ وہ یہ گیمز موبائل سکرین کی بجائے بڑی سکرین پر دیکھیں۔ ایک تو ان کی بینائی خراب نہ ہوگی، دوسرا خلوت کی خرابیوں سے بھی بچ جائیں گے۔ ایک اور فتنہ اس خلوت نشینی سے ہمارے معاشرے میں بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے اور وہ الحاد ہے بچے والدین سے دور ہونے کے ساتھ ساتھ خدا اور رسول کے باغی اور دین بیزار ہوتے جا رہے ہیں۔ اللہ کریم ہمیں ان آفات سے بچائے۔ آمین

سوشل میڈیا ہمارے خاندانی نظام اور مذہبی نظام کو آہستہ آہستہ ایک اژدھے کی طرح لقمہ بنا رہا ہے عافیت اسی میں ہے کہ اس کے قلیل منافع سے گریز کرتے ہوئے اس کے پیدا کردہ بڑے نقصانات سے بچنے کے لیے اس سے حتی المقدور دور رہا جائے۔

تفہیم مغرب

تحریر: Stephan Richter
ترجمہ: محمد ابراہیم خاں

امریکہ زوال کی راہ پر

[ہم جب کسی جگہ امریکہ کے زوال یا چین کے اُبھرنے کی بات پڑھتے یا سنتے ہیں تو ہمیں کوئی خوشی نہیں ہوتی کیونکہ ہم مسلمان ابھی تک زوال سے نکلنے اور دنیا وآخرت میں کامیابی کی طرف بڑھنے کے لیے یکسو نہیں ہوئے، جس کا ذریعہ ہے رجوع الی الاسلام یعنی اسلامی تعلیمات پر عمل اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اور مغرب کی پیروی کا ترک۔ کاش امت مسلمہ یہ جان لے۔ یا لیت قومي يعلمون۔ مدیر]

یہ حقیقت سمجھنے میں بہت سے لوگ شدید غلطی کر جاتے ہیں کہ کوئی بھی ملک چاہے جتنی بھی ترقی کر لے، پہلے انحطاط پذیر ہوتا ہے اور پھر زوال سے دوچار ہوتا ہے۔ ایسا بالعموم اِس لیے ہوتا ہے کہ انتہائی قابلِ رشک نوعیت کی ترقی اور خوشحالی ممکن بنا لینے کے بعد یہ ممالک بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ انسان جب بہت کچھ پا لیتا ہے تو اپنے حقوق پر بہت زور دیتا ہے مگر فرائض بھول جاتا ہے۔ وہ پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں بند کر لینا چاہتا ہے مگر یہ بھول جاتا ہے کہ دنیا میں دوسرے بھی ہیں جن کے ہاتھ ہیں اور وہ بھی پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں بند کرنے کے خواہش مند ہیں۔ وائمر کے دور میں جرمنی غیر معمولی بلکہ قابلِ رشک ترقی کا مظہر اور طاقت کا حامل تھا۔ آج امریکا بھی بہت سے معاملات میں قابلِ رشک ہے مگر اس حقیقت کو سب نے بھلا دیا ہے کہ اگر انتباہی علامات نظر انداز کر دی جائیں تو دنیا کے لیے مثال بننے والی ترقی کے حامل ممالک بھی بہت تیزی سے انحطاط کا شکار ہو سکتے ہیں اور پھر اُن کا مکمل زوال کوئی روک نہیں سکتا۔

۲۰۱۷ء اور ۲۰۲۰ء کے دوران یعنی ڈونلڈ ٹرمپ کے پہلے دورِ صدارت میں جب بھی امریکی دوست برلن آتے تھے تو میں اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر "آزاد دنیا میں آپ کا خیر مقدم ہے" کہتے ہوئے اُن کا استقبال کرتا تھا۔ اِس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ دیوارِ برلن

گرانے اور مشرقی و مغربی جرمنی کو دوبارہ ایک کرنے میں امریکی سفارت کاری اور عسکری قوت نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اور بعد میں بھی برلن والوں کی آزادی کو برقرار رکھنے میں اُس کا کردار اہم رہا تھا۔

مگر پھر بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ ڈونلڈ ٹرمپ آ گئے۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے دوبارہ امریکی ایوانِ صدر میں قدم رکھا ہے اور دنیا بھر میں بہت کچھ الٹ پلٹ ہو رہا ہے۔ مَیں اب بھی امریکا سے آنے والوں کا خیر مقدم اِنہی الفاظ کے ساتھ کرتا ہوں مگر اب تناظر بدل چکا ہے، ماحول کچھ اور ہے۔ الفاظ وہی ہیں مگر اُن کا اثر اور تاثر یکسر مختلف ہے۔ ایک عشرے کے دوران دنیا بہت بدل گئی ہے۔ بہت کچھ مٹ رہا ہے اور بہت کچھ تیزی سے منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ بڑی طاقتوں کے لیے بھی یہ وقت مشکلات سے بھرا پڑا ہے۔ پسماندہ اور ترقی پذیر دنیا کی مشکلات کو رونے کا وقت گیا۔ اب سبھی ایک کشتی کے سوار ہیں۔ جن کی جیبیں اور تجوریاں بھری ہوئی ہیں، وہ بھی پریشان ہیں۔ قابلِ رشک ترقی بھی انسان کو سکون نہیں دے رہی۔

میں نے جب عشروں قبل جرمنی چھوڑ کر امریکا میں مستقل سکونت اختیار کی تھی تب میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند عشروں میں دنیا اِتنی بدل جائے گی۔ مَیں نے حال ہی میں سیبیسٹین ہیفنر (Sabisten Hefner) کی کتاب "*Memoirs of a German*" (میموئرز آف اے جرمن) پڑھی تو حیران رہ گیا۔ اُن کی بصیرت کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

سیبیسٹین ہیفنر نازیوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے دور میں طالبِ علم تھے۔ جب نازیوں نے جرمنی کو اپنے ہاتھ میں لیا تب ہیفنر برلن کے لا اسکول کے گریجویٹ تھے۔ دوسرے بہت سے جرمن باشندوں کی طرح ہیفنر کو بھی جان بچانے کے لیے جرمنی سے بھاگنا پڑا۔ وہ لندن گئے اور بعد میں ایک بڑے مصنف کے طور پر ابھرے۔ اُنہوں نے ۱۹۷۹ء میں "دامیننگ آف ہٹلر" (*The Meaning of Hitler*) لکھی جس نے عالمگیر شہرت پائی۔

روزمرہ زندگی میں سرایت

ہیفنر نے لکھا ہے کہ میں جب جرمنی میں اسکول کی سطح پر تعلیم حاصل کر رہا تھا تب بہت سی ایسی تصویریں دیکھ چکا تھا جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کس طرح نازی فوجوں نے

برلن کی سڑکوں پر مارچ کیا ہوگا اور کس طور اپنی طاقت منوائی ہوگی۔ روزمرہ زندگی میں نازیوں کے اثرات کا دائرہ وسیع کرنے کے عمل کے بارے میں ہیفنر نے بہت عمدگی سے لکھا ہے۔ تب جرمنی فقید المثال ترقی سے ہم کنار تھا۔ فطری علوم وفنون، فنونِ لطیفہ اور تہذیب و ثقافت کے حوالے سے جرمنی بہت تیزی سے مستحکم تر ہوتا جارہا تھا۔ یہ سب کچھ تب تک تھا جب تک عسکری قوت بننے کا خبط پیدا نہیں ہوا تھا۔ جب نازی اِزم آیا اور نازیوں نے اقتدار پر قبضہ کیا تو صرف طاقت کا اظہار ہی سب کچھ ہوگیا۔ نازی جرمنی زیادہ سے زیادہ توسیع چاہتا تھا۔ وہ خطے کے تمام ممالک کو ہڑپ کرنے کے فراق میں تھا۔ حد یہ ہے کہ اُس نے روس کو بھی زیرِ نگیں کرنے اور رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ فرانس کا جو حشر ہوا وہ تو دنیا نے دیکھا۔ نازی جرمنی نے قدم بڑھایا اور فرانسیسیوں نے بہ رضا و رغبت ہتھیار ڈال دیے۔

جرمنی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کررہا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ایک مطلع العنان حکمران نے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دنیا نے دیکھا کہ جرمنی کی ترقی کا سفر رُک گیا۔ جو جرمنی دنیا کے لیے ترقی وخوشحالی اور تہذیب وثقافت کا نمونہ بنتا جارہا تھا، وہ محض عسکری قوت بن کر رہ گیا۔

ایسے تماشے دنیا بھر میں ہوتے رہے ہیں۔ جب بھی کوئی مطلق العنان آمر کسی ریاست کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو اپنے اقتدار کو طُول دیتے رہنے کے لیے طاقت کا بے محابا استعمال یقینی بناتا ہے۔

مَیں جب ہیفنر کی کتاب پڑھ رہا تھا تب مجھ پر بہت کچھ کُھلتا چلا گیا۔ دنیا بھر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو اچھی طرح سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ میں نے پڑھا کہ جب تک نازیوں نے جرمنی میں اقتدار پر قبضہ نہیں کیا تھا تب تک جرمنی بھرپور ترقی کی منزلیں طے کررہا تھا۔ بالکل ایسا ہی معاملہ ٹرمپ کا بھی ہے۔ جنوری ۲۰۲۵ء میں ٹرمپ کے دوبارہ صدر بننے تک امریکا جو کچھ کررہا تھا، اُس سے اب بہت دور ہو چکا ہے۔ ٹرمپ کی ایوانِ صدر میں دوبارہ آمد سے قبل تک امریکا میں سول سوسائٹی بہت مضبوط تھی۔ اظہارِ رائے کا معاملہ بہت اچھا تھا مگر اب بہت کچھ داؤ پر لگتا دکھائی دے رہا ہے۔ امریکی معاشرے میں انتہائی نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔ امریکی قیادت ایک بار پھر مشرقِ وسطیٰ میں الجھ رہی ہے۔ طاقت کے استعمال

کو ایک بار پھر غیر معمولی اہمیت دی جا رہی ہے۔ عالمی سطح پر امریکا کو relevant رکھنے کے لیے امریکی قیادت طاقت کے غیر معمولی استعمال کو سب سے بڑے ہتھکنڈے کا درجہ دے رہی ہے۔

دنیا کو اندازہ ہو چکا ہے کہ امریکی ایوانِ صدر میں ڈونلڈ ٹرمپ کی دوبارہ آمد کوئی اچھا شگون نہیں۔ امریکا نے اپنی فوج کو دنیا بھر میں اُتار رکھا ہے۔ اِس کے نتیجے میں امریکی معیشت پر دباؤ بھی بہت بڑھا ہے۔ امریکا میں بہت کچھ بدل رہا ہے۔ رائے عامہ بُری طرح منقسم ہے۔ عالمی سطح پر امریکا کی ساکھ بُری طرح مسخ ہو چکی ہے۔ امریکا نے اپنے دروازے بند کرنے کا عمل تیز کر دیا ہے۔ ویزا کی شرائط اور پابندیاں بہت بڑھا دی ہیں۔ ۹ دہائیوں پہلے کی بات ہے کہ جرمنی میں سخت گیر حکومت اچانک مطلق العنان نوعیت کی حکمرانی میں تبدیل ہوئی تھی اور ملک ٹھکانے لگ گیا تھا۔ امریکا کو بھی کچھ ایسی ہی صورتحال کا سامنا ہے۔

اب یہ بات بھی کُھل کر کہی جا رہی ہے کہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران امریکا نے فطری علوم و فنون میں غیر معمولی رفتار سے پیشرفت اِس لیے ممکن بنائی تھی کہ نازیوں سے جان بچا کر فرار ہونے والے بیشتر جرمن یہودی سائنسدانوں نے امریکا کا رُخ کیا تھا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جرمنی کے بہترین ذہن امریکا کو مفت میں مل گئے تھے۔ جرمنی سے جان بچا کر امریکا میں سکونت اختیار کرنے والے اِن یہودی سائنسدانوں نے امریکا کو حقیقی معنوں میں سپر پاور بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

گزشتہ صدی کے ابتدائی نصف میں جس صورتحال کا سامنا جرمنی کو تھا، کچھ کچھ ایسی ہی صورتحال کا سامنا اب امریکا کو ہے۔ تب جرمنی سے سائنسدان بھاگے تھے، اب امریکا سے بھاگ رہے ہیں یا بھاگنے کے لیے پَر تول رہے ہیں۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جس طور نازیوں نے فطری علوم و فنون کی ترویج روکی تھی اور تحقیق کی راہ میں دیواریں کھڑی کی تھیں، بالکل اُسی طرح اب ٹرمپ انتظامیہ نے امریکا میں فطری علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کی راہ میں روڑے اٹکانا شروع کر دیے ہیں۔ تحقیق کے لیے کی جانے والی فنڈنگ میں انتہائی درجے کی کمی واقع ہو چکی ہے۔ معاشرے کی بہتری کے لیے سرکاری سطح پر جو فنڈنگ اب تک کی جاتی

رہی ہے، اُس میں بھی پریشان کن حد تک کمی واقع ہوتی ہے۔ امریکا میں اب تک خانہ جنگی کی کیفیت تو پیدا نہیں ہوئی مگر شہریوں کی آزادی سلب کی جارہی ہے، مختلف بنیادوں پر نفرت کو ہوا دی جارہی ہے۔ تارکینِ وطن کی آمد روک کر امریکا میں موجود اور بسے ہوئے تارکینِ وطن کے خلاف فضا تیار کی جارہی ہے۔

بہت کچھ ہے جو بہت سی کہانیاں سُنا رہا ہے مگر امریکی قیادت کچھ سُننے، دیکھنے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ امریکی معاشرہ تیزی سے انحطاط پذیر ہے اور مکمل زوال کی طرف اُس کا سفر تیز ہوگیا ہے مگر بہت سی واضح علامات کو بھی امریکی قیادت یکسر نظر انداز کررہی ہے۔

یہ نکتہ کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ امریکی معاشرے کا انحطاط کم و بیش پندرہ سال قبل شروع ہوا تھا۔ تب سے اب تک بہت کچھ بدل اور بگڑ چکا ہے مگر کوئی نہیں جو اس طرف پوری سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہو۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ امریکا میں اس وقت جو خرابیاں پائی جارہی ہیں، وہ سب کی سب ڈونلڈ ٹرمپ کی پیدا کردہ نہیں تاہم وہ معاملات کو درست کرنے کے بجائے، اُن سے اپنے لیے فوائد کشید کررہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بگاڑ کا دائرہ مزید وسعت اختیار کرے۔

امریکا میں قوم کے لیے سوچنے کا رجحان دم توڑ جارہا ہے۔ لوگ صرف انفرادی کامیابی اور خوشحالی کو سب کچھ سمجھنے لگے ہیں۔ ملک چاہے کسی بھی سمت جارہا ہو، وہ صرف اپنا بھلا چاہتے ہیں، اپنی یعنی انفرادی کامیابی ہر حال میں یقینی بنانا چاہتے ہیں۔

امریکا کی نجی محفلوں میں غیر معمولی تعلیم یافتہ اور دُنیوی اعتبار سے انتہائی کامیاب افراد معاشرے کے بنیادی مسائل کے بارے میں گفتگو سے گریز کرتے ہیں۔ کسی کو اس بات سے کچھ بھی غرض نہیں کہ معاشرہ بہتر ہونا چاہیے، سب کو ڈھنگ سے جینے کا موقع ملنا چاہیے۔ ایسی نجی محفلوں میں لوگ صرف اپنی ذات کا، اپنے مفادات کو لاحق خطرات کا رونا رو رہے ہوتے ہیں۔ یہ ہے آج کا امریکا۔ معاشرے اور ریاستی نظام کو درپیش سنگین مسائل کے بارے میں بحث و تمحیص کی بجائے لوگ فلموں اور ایسے ہی دوسرے موضوعات پر بات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ہے امریکی معاشرے کی سچائی۔

ایک بڑا ٹرننگ پوائنٹ

میرے نزدیک تو یہ ایک بڑا ٹرننگ پوائنٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت امریکا میں بہت سے اہلِ علم، اہلِ کمال انتہائی نوعیت کی بیزاری محسوس کررہے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ امریکا میں میرے قیام کی مدت بھی اب پوری ہوا چاہتی ہے۔ جب کسی معاشرے سے لبرل اشرافیہ نکلنے لگتی ہے اور اہلِ کمال جان بچا کر بھاگنے کی سوچنے لگتے ہیں تب پورے معاشرے کو اِس کی بہت بھاری قیمت چُکانا پڑتی ہے۔ اب امریکا کو بھی ممکنہ طور پر اس مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ پہلے تو امریکا نے دنیا بھر سے بہترین ذہن اپنی طرف متوجہ کیے اور اب وہ فطری علوم وفنون اور دیگر شعبوں میں پیشرفت کی راہیں خود ہی مسدود کررہا ہے۔ امریکا میں ڈھائی عشروں سے یہی کچھ ہورہا ہے۔ جو آزادی کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں، وہ امریکا سے نکلنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ جنہیں فطری علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں زیادہ وسیع البنیادی تحقیق کرنی ہے، وہ یورپ یا کہیں اور منتقل ہونے کے لیے بے تاب ہیں۔

ڈیموکریٹس نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری

بل کلنٹن اور براک اوباما ڈیموکریٹ صدور تھے۔ اِن دونوں کے ادوارِ صدارت کے دوران امریکا میں ٹیکس کی پالیسی بہت اچھی تھی۔ معیشت مستحکم ہوئی۔ اِن دونوں نے جس انداز سے حکومت کی، اُسے دیکھ کر لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ امریکا میں ری پبلکنز کے برسرِ اقتدار آنے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہونی چاہیے۔ بل کلنٹن اور براک اوباما نے بلند آمدنی والوں کے مفادات کو محفوظ کرنے کے حوالے سے پہلے ہی بہت کچھ کردیا تھا تو پھر اُنہیں کیا ضرورت پڑی کہ ڈیموکریٹس کونا کام بنا کر ری پبلکنز کو اقتدار میں لائیں؟

ڈیموکریٹس سے ایک بنیادی غلطی یہ سرزد ہوئی کہ اُنہوں نے شناخت کی سیاست پر بہت زیادہ توجہ دی۔ امریکا کے محنت کش طبقے کی آمدنی بڑھانے اور اُسے معیاری انداز سے جینے کا موقع دینے پر توجہ دینے کے بجائے ڈیموکریٹس یہ سمجھتے رہے کہ اپنی شناخت قائم رکھ لینا بھی کافی ہے۔ لوگ اِس غلطی سے بپھر گئے۔ اِس ایک غلطی نے امریکا میں بلیو کالر جاب کرنے والوں کو ری پبلکنز کے ہاتھ میں دے دیا۔ ٹرمپ نے چکنی چپڑی باتیں کرکے اُنہیں شیشے میں اُتار لیا۔ (بقیہ صفحہ نمبر ۱۵)

اسلام اور مغرب

ڈاکٹر سلمان آصف صدیقی

مغربی تہذیب کے پیدا کردہ چیلنجز

صاحب ایمان فرد کا امتحان

جدید معاشروں کی سرگرمیاں پانچ وسائل سے متعین ہوتی ہیں۔

۱۔جدید سائنس ۲۔ٹیکنالوجی ۳۔سرمایہ

۴۔انسانی عقل ۵۔خواہشاتِ نفس

جدید مغربی تہذیب کے یہی پانچ بڑے خدا ہیں۔جدید تعلیم یافتہ انسان اپنے ہر مسئلے کے حل کے لیے انہی پانچ خداوں کی طرف دیکھتا ہے۔ان کے ہاں کوئی مسئلہ اسی وقت بڑا مسئلہ سمجھا جاتا ہے، جب یہ پانچ خدا اس کا حل دینے میں ناکام ہوجائیں۔ایسی صورت میں جدید معاشرہ شدید خوف، گھبراہٹ اور مایوسی کا شکار ہوجاتا ہے۔ایمان لانے والے فرد کا معاملہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ کسی بھلے مقصد کے لیے ان وسائل کو اپنے ایمانی نقطۂ نظر کے تحت دیکھے اور دین کی شرائط بندگی بروئے کار لائے لیکن اس قابل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان پانچ وسائل کی پوشیدہ قباحتوں سے بخوبی واقف ہو اور ان کے امکانی شر سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے نفس کی نگرانی اور تزکیہ کرتا رہے۔ایمانی تناظر میں مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مسلمان کا بھروسہ، اعتبار، یقین اور اُمیدیں ان پانچ اسباب پر قائم ہوجائیں اور وہ ان اسباب کے نفسیاتی، معاشرتی اور ماحولیاتی نقصانات سے لاعلم رہتے ہوئے ان کا استعمال کرتا رہے۔جدید مغربی تہذیب کی ترقی کی بنیاد خدائے واحد اور روح کے انکار کو قرار دیا جاتا ہے لہٰذا اس کا تصور مسئلہ بھی مادی ہے اور اس کی تشخیص کے اسباب اور حل کی نوعیت بھی مادی ہے۔وہ مسائل جو غیر مادی یا روحانی نوعیت کے ہیں، ان کی شناخت جدید سائنس نہیں کر پاتی اور اگر کسی وجہ سے وہ عیاں ہو بھی جائیں تو انہیں توجہ کے لائق نہیں سمجھا جاتا، جدید سائنس، مادی دنیا کے حوالے سے اپنی دانست میں جو مفروضے اور اندازے قائم کرتی ہے اور انکشافات اور ایجادات ممکن بناتی ہے، وہ عموماً انسان کی مادی خواہشات ہی کا احاطہ کرتے ہیں،

اس کی زندگی کی معنویت کا نہیں، زندگی کی معنویت کا تعین کرنے والا نظام الہامی ہدایت سے استفادہ کر کے ہی ممکن ہے۔

انسان کی زندگی کا بامعنی ہونا، اس کی زندگی میں آسائشوں کے ہونے سے کہیں زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے کائنات میں فساد پیدا کرنے کے علاوہ انسان کو سرمایہ دارانہ نظام کی غلام گردشوں میں اُلجھا کر رکھ دیا ہے۔ مسلمان کی ذمہ داری یہ تھی (اور یہ ہے) کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنائی ہوئی دُنیا کا اسیر بننے کی بجائے اس فساد کی نشاندہی کرے، جو ہوس کے نتیجے میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے پیدا کر رکھا ہے اور جس سے مغربی دنیا کا عام آدمی ابھی تک ناواقف ہے۔ المیہ یہ ہے کہ آج کا مسلمان اپنے ضعف علم و ایمان کے باعث اس فرق کو نہیں پہچان پایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلم معاشرے، غالب مغربی تہذیب کے علمی اور عملی انکار کے بجائے اس کی مرعوبیت اور غلامی کا بُری طرح شکار ہیں اور ترجیحات کی لگ بھگ اُسی ترتیب میں اپنے معاملاتِ زندگی طے کر رہے ہیں جو خدائے واحد کے انکار کرنے والوں نے بنائی ہے۔

محض سرمایے کی محبت اور اس میں اضافے کی فکر اور اس سے اپنی توقعات کا وابستہ ہو جانا، مسلمان کے ایمان کے لیے انتہائی مہلک ہے۔ مال اسی صورت میں اللہ کا فضل ہے جب تک مسلمان کا دل اس کی محبت سے خالی ہے، بصورتِ دیگر یہ ایک بڑا فتنہ ہے، مسلمان کے پاس جتنی بھی دولت آ جائے، اس کی اپنے مستقبل سے بے فکری کی بنیاد، سرمایے پر بھروسہ یا انحصار نہیں بلکہ اللہ کی رزّاقی پر یقین ہونا چاہیے۔ اسی طرح مسلمان کو تنگدستی میں بھی اپنے مسائل کے حل کے لیے سرمایے کی تمنا کرنے کی بجائے اللہ کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے حصے کی کوششیں کرنی چاہئیں۔ عقل اللہ کی دی ہوئی انتہائی اہم نعمتوں میں سے ایک ہے اور عقل کے تین بڑے امتیازات ہیں:

پہلا یہ کہ عقل، حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حقیقت تک پہنچنا اس کی روشن مثال ہے۔

دوسرا یہ کہ عقل، علم نافع کی روشنی میں نفس کے میلانات اور داعیات کا محاسبہ کرتی ہے۔

تیسرا یہ کہ عقل، معاملاتِ زندگی کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے میں انسان کی مدد کرتی ہے

انسان کی فطرت اسے فوری فائدے کی طرف للچاتی ہے اور عقل یہیں دھوکا کھا جاتی ہے، وہ بڑی تمکنت کے ساتھ چند روزہ زندگی کے فائدے کو ہمیشہ کی زندگی کے فائدے پر فوقیت دے کر یہ سمجھتی ہے کہ اس نے بڑا کمال کیا ہے۔ پھر غالب تہذیب کا تصورِ کامیابی اس کے ایمانی تصورِ کامیابی پر غالب آجاتا ہے۔ عقل کا دوسرا بڑا مسئلہ اس کا گھمنڈ اور اپنی استعداد پر ناز ہے، عقل کی یہ ترنگ اسے وحی سے بے نیاز کر دیتی ہے، انسان اس صورت میں اس زعم میں مبتلاء ہوجاتا ہے کہ وہ خیر اور حق کا تعین خود کرسکتا ہے، اس کا اپنی عقل پر یہ ایمان پیدا ہوجاتا ہے کہ میری عقل ہر مسئلے کا حل دے سکتی ہے۔ مجرد عقل کے ساتھ گمراہ ہونے کی بہت بڑی مثال ابوجہل کی ہے، جس کو اس کی قوم نے عقل میں بلند ہونے کی وجہ سے ابوالحکم کا خطاب دے رکھا تھا۔ ابلیس نے جب آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اس کی بنیاد عقل کی ایک منطق تھی کہ ''میں جو آگ سے بنا ہوں، اس گارے سے بنی مخلوق کے آگے کیوں سر جھکاؤں''؟ ابلیس نے اللہ کی اطاعت کو محض عقل کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ دین کے تناظر میں عقل منصف نہیں ہے بلکہ بندگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے وجود (جس میں عقل بھی شامل ہے) کو اللہ کا مطیع بنالے، سجدہ اسی بات کا علامتی اعتراف ہے کہ انسان اپنی عقل کو اللہ کے علم، حکمت، دانائی اور قدرت کے سامنے کچھ نہیں سمجھتا۔ اپنی عقل کے بھرپور استعمال کے باوجود اس کا اصل بھروسا اور یقین اللہ کے علم و حکمت پر ہوتا ہے۔ یہی اس کا تصورِ عقل مندی ہے، بندۂ مومن کی عقل، اللہ کی اطاعت کرنے میں حیل و حجت نہیں کرتی۔ درحقیقت اسی عقل کو عقلِ سلیم کہتے ہیں۔ جدید مغربی تہذیب میں عقل کا بہت بڑا مصرف، نفسانی خواہشات کی تکمیل کے راستے تلاش کرنا اور ان پر چلتے رہنا ہے۔ ایمانی مناسبت سے عقل کا ایک بہت اہم مصرف ان خواہشات کا تجزیہ اور محاسبہ ہے، انسان کا اگر ہر لحہ تزکیہ ہوتا رہے اور اسے نفسِ مطمئنہ حاصل ہوجائے تو اس کی خواہشات بہت نفیس اور پاکیزہ ہوجاتی ہیں۔

انسان کی بے پناہ خواہشات اسے نفس کی غلامی میں دھکیل دیتی ہیں، انسان کی خواہشات چپکے چپکے اس کا اِلٰہ بن جاتی ہیں۔ جھوٹے ربّ اور جھوٹے الٰہ کا فرق سمجھنا بھی ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ اگر انسان غیر مشروط طور پر اپنے دل کی خواہشات کے پیچھے چل

رہا ہو یا اس کی پیروی کر رہا ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ خواہشات اس کا الٰہ ہیں اور اگر وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس کی عقل سارے مسائل حل کر دے گی تو اس کا مطلب ہے کہ عقل کو ربّ کا درجہ مل گیا ہے۔ ربّ اور الٰہ کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ مسلمان خود کو جھوٹے خداؤں کے پھندے سے نکال سکے۔ جدید مغربی تہذیب اور سرمایہ دارانہ نظام ان پانچ جھوٹے خداؤں سے جُڑا ہے، جس نے اللہ کی نشانیوں کو نظر سے اوجھل کر کے سارے عالم کو بُت کدہ نما بنا دیا ہے۔ انہی جھوٹے خداؤں نے آج مسلمانوں کو اپنے نرغے میں لے رکھا ہے۔

کورونا وائرس کے نتیجے میں جو صورتِ حال پیدا ہوئی اسے دنیا کچھ وقت کے لیے تو سمجھ ہی نہ پائی کہ مسئلہ کیا ہے؟ اور اس کو کیسے سنبھالنا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہ آنے والی کیفیت گھبراہٹ اور شدید خوف کا باعث بن گئی، ایسا خوف جو انسان کی نفسیاتی اور جسمانی صحت کے لیے مضر ہو۔ وہ ایمان کی کمی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اور پھر ایمان کو مزید کمزور تر کر دیتا ہے۔ خوف کی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو پھر اللہ کے سوا دنیا کی کوئی طاقت اسے انسان سے نہیں نکال سکتی۔ وہ لوگ جو اللہ پر یقین رکھتے ہیں، انہیں بے خوف اور بے غم رکھنے کے لیے اللہ، فرشتوں کو خصوصی احکام کے ساتھ نازل کرتا ہے۔

جن لوگوں نے کہا کہ ''اللہ ہمارا ربّ ہے، اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور اُن سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو، نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اُس جنّت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، ہم اس دُنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی، وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی، یہ ہے سامانِ ضیافت اُس ہستی کی طرف سے جو غفور و رحیم ہے (حٰمٓ السجدہ: ۳۰۔۳۲)۔ جب انسان ایک اللہ کو چھوڑتا ہے تو اسے بہت سارے خدا بھی کافی نہیں ہوتے۔ مغربی نفسیات میں ''ذہن کا مادّے پر تصرف'' کے عنوان سے ایک پورا نقطۂ نظر موجود ہے جو بتاتا ہے کہ ''اگر آپ کو چوٹ لگ جائے لیکن آپ کو ذہنی طور پر اس بات کا یقین دلا دیا جائے کہ یہ کچھ بھی نہیں ہے تو وہ واقعی کچھ بھی نہیں ہوتا'' اسی طرح ''مصنوعی دوا'' (placebo medicine) کے حوالے سے ہونے والی تحقیقات نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ ''ذہن کی

کیفیت اور دل کے یقین کی اہمیت کسی مرض کے علاج میں دوا سے کہیں زیادہ ہے''۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کے نہ ماننے والے اس نظریے تک پہنچ گئے ہیں۔ اس صورتحال میں اللہ کو نہ ماننے والوں کے لیے اللہ کو ماننے کا بہت بڑا امکان پیدا ہوگیا ہے۔ خوف اور گھبراہٹ کا تسلسل اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ آپ کسی معاملے، مسئلے یا خطرے کو بہت بڑا جان لیں اور اپنے وجود کی گہرائیوں میں اس کی بڑائی کو محسوس کرنا شروع کردیں۔ خوف کی یہ صورت فرد کی ایمانی اور نفسیاتی صحت کے لیے شدید نقصان دہ ہے۔ ایک بندۂ مومن کو ہر لمحہ اس بات کا احساس اور یقین ہونا چاہیے کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے، وہ کارساز ضرور میری مشکل حل کردے گا۔ مومن کے لیے صرف ایک ہی خوف جائز ہے اور وہ ہے روزِ آخرت اپنے عمل کی جواب دہی کا خوف۔ اسلام لانے اور اللہ کو اپنے معبود ہونے کا اقرار کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اب دل میں کسی کی ایسی بڑائی اور عظمت قبول نہیں کی جاسکتی جس سے اللہ کے ساتھ تعلق اور اس کی عظمت پر حرف آئے۔ خوف کا شدت اختیار کر جانا دراصل بندے اور اللہ کے درمیان تعلق کے تعطل کا سبب بن جاتا ہے، اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اب دل صرف اور صرف اللہ کا ہوگیا ہے، اس میں کسی اور کے آنے کی گنجائش اللہ کے دیے ہوئے احکامات کی تعمیل کے حوالے سے ہی ممکن ہوسکتی ہے۔

ایک عالمی ادارے Worldometers کی رپورٹ کے مطابق اس وقت دنیا میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ انسان ایک دن میں موت کا شکار ہوجاتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ ایک ماہ میں تقریباً ۴۵ لاکھ اور تین ماہ میں تقریباً ایک کروڑ ۳۵ لاکھ انسان اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، جبکہ کورونا وائرس سے گذشتہ آٹھ ماہ، یعنی فروری سے ستمبر ۲۰۲۰ء کے دوران تقریباً ۹ لاکھ ۴۲ ہزار ہلاکتیں ہوئی ہیں، سوال یہ ہے کہ یہ لاکھوں لوگ روزانہ مر کر کہاں جارہے ہیں؟ ان کا کیا بن رہا ہے؟ بات یہ ہے کہ یہ لوگ زمان ومکان اور جسم وعمر کی قید سے باہر نکل جاتے ہیں اور درحقیقت واپس بلا لیے جاتے ہیں، ان لاکھوں مرنے والوں میں سے بہت بڑی تعداد کو اپنی موت سے چند منٹ پہلے تک بھی یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ ان کے اس دُنیا میں آخری لمحات ہیں، عقیدے اور ایمان کے تناظر میں اصل سوال یہ نہیں ہے کہ کسی وائرس یا بیماری سے کیسے بچا جائے؟ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ اپنی موت کی تیاری کیسے کی جائے؟ (بقیہ صفحہ نمبر: ۷۷)

عالم اسلام حامد کمال الدین

عالم اسلام میں مؤثر اسلامی جدوجہد کی تاریخ

مایوس ہونے کی ضرورت نہیں

فیس بک کی ایک پروموشن پوسٹ پر اتفاقاً میری نظر پڑ گئی۔ کسی خاتون نے ۱۹۷۰ء کے لاہور کی ایک تصویر شیئر کر رکھی تھی، اور ساتھ ''نوٹ'' کروانے کی بات جو اس نے کہنا ضروری جانی: ٹانگے کی سواریوں میں ایک بھی خاتون نے حجاب نہیں کیا ہوا۔

دلچسپ! بات تھوڑی نوٹ کرنے کی ہے بھی...... اور اس کے ساتھ جاننے کا بہت کچھ بھی۔

عالم اسلام کی ہماری حالیہ تاریخ میں سن ستر کی دہائی کا آواخر دراصل ہماری دینی بیداری کے نئے قوی تر دور کا آغاز مانا جاتا ہے:

۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ، جس میں کم از کم میدان کے اندر انور السادات کے مصر نے، ۱۹۶۷ء والی جمال عبدالناصر والی شکست کے برعکس، بہت اچھی کارکردگی دکھائی تھی، جس سے عرب سٹریٹ کو ولولہ تازہ عطا ہو گیا تھا، اگرچہ وہ ''ولولہ'' انور السادات کو پیچھے چھوڑ گیا ہو اور ''اسلامیوں'' کو اپنا غلغلہ بلند کرنے کا ایک زبردست موقع دے گیا ہو۔

۱۹۷۷ء: پاکستان میں تحریکِ نظامِ مصطفیٰ

۱۹۷۸ء: ایرانی انقلاب

۱۹۷۹ء جہاد افغانستان کا آغاز (جس میں ملتِ مغرب نے اپنی تاریخ کی ایک بڑی غلطی کی۔ سوویت خطرے سے بچنے کے لیے مغربی بلاک کے زیر اثر مانے جانے والے ملکوں میں جذبۂ جہاد کو ''اپنے'' کام میں لانے کی ایک مکارانہ کوشش، جو خود اسی کے گلے پڑ گئی)۔ افغانستان میں شروع ہونے والا یہ ''مقامی'' عمل چند سالوں میں ایک ''گلوبل فنامنا'' بن گیا۔ اس کے تحت اسّی کی دہائی کے شروع سالوں میں مصر، الجزائر، تیونس، مراکش، شمالی یمن، سعودی عرب، پاکستان اور دیگر ''مغربی'' بلاک کے اسلامی ممالک میں تو حکومتی و سرکاری سطح پر اس

جذبۂ جہاد کو جگایا گیا جبکہ لیبیا، جنوبی یمن، شام، عراق وغیرہ ایسے ''مشرقی'' بلاک کے اسلامی ملکوں میں ''اپوزیشن'' کے اسلامی دھڑوں کو اس نیک مشن کی راہ دکھائی گئی۔ یہاں تک کہ روس کے زیر قبضہ وسط ایشیائی ریاستوں میں موجود اسلامی عنصر کو اٹھایا جگایا گیا۔ سمجھدار اسلامی قیادتوں نے اس تاریخی ''موقع'' کو بڑے زیرک انداز میں استعمال کیا؛ اور ''مواقع'' کا اچھا استعمال تہذیبوں کا حق ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ''اسلامی بیداری'' اسّی کی دَہائی سے شروع ہونے والا ایک بڑا عالمی فنامنا مانا گیا۔ کئی عرب ممالک میں تو یونیورسٹیوں سے بسیں بھر کر جہاد کے قافلے روانہ ہوئے۔

۱۹۸۲ء شام میں اخوان سے پھوٹنے والی ''الطلیعۃ'' کی غیر معمولی اٹھان، جس کو کچلنے کے لیے حافظ الاسد نے حماۃ شہر پر ٹینک چڑھا دیے اور درجنوں ہزاروں لوگوں کو یکبارگی شہید کر دیا۔ مگر یہ اس پورے خطے کے اندر اسلامی بیداری کے حق میں ایک نہایت گہرا اور دوررس واقعہ ثابت ہوا۔ ''شہادتیں'' عالم اسلام کی مٹی میں بویا گیا ایسا بیج ہیں جو عرصے بعد سہی اپنا ثمر ضرور دیتی ہیں۔

اِسی اَسّی کی دَہائی میں جیسا کیسا، پاکستان اور سوڈان میں اسلامی تجربہ ہوا۔ ان دونوں تجربوں کی بابت آپ جو بھی کہیں، حتیٰ کہ اسے حکمرانوں کی جانب سے کھیلا گیا ایک سیاسی کارڈ کہہ لیں، اس سے یہ بہرحال ثابت ہوتا ہے کہ لوگ اب یہاں اسلام کا مطالبہ کرنے لگے تھے، اور وہ بھی اس درجے میں کہ اسلام کا نعرہ لگا کر، اور کچھ اسلامی اقدامات کر کے، ان کے دل جیتے جا سکتے تھے۔ یہ اسلام کے مقبول اور طاقتور ہو جانے کی ایک دلیل تو ہوئی نا۔

اسّی کی دَہائی کے اواخر تک ہم دیکھتے ہیں، کشمیر میں نیشنلسٹ لہجوں نے اپنا زور کھو دیا اور کشمیری مزاحمت میں ایک واضح اسلامی ٹون نے اُس نیشنلسٹ لہجے کی جگہ لے لی، جو دن بدن اپنے اسلامی تشخص میں مضبوط ہوتی چلی گئی۔

عین اُسی عشرے کے اواخر میں فلسطین میں عرب نیشنلسٹ سوشلسٹ تحریک پی ایل او دم توڑ گئی اور اس کی جگہ فلسطینی مزاحمت پر ''اسلامیوں'' کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۹۸۸ء میں سامنے آنے والی ''انتفاضہ'' خالصتاً ایک اسلامی پیش رفت تھی اور فلسطینی مزاحمتی تاریخ کا ایک بالکل نیا

موڑ۔

۱۹۹۰ء میں الجزائر میں ''جبهة الانقاذ الاسلامیه '' (اسلامک سالویشن فرنٹ) کی بلدیات کے انتخابات میں بھاری کامیابی، اور کم از کم بلدیاتی سطح پر پورا ملک "اسلامیوں" کے قبضے میں آجانا۔اور پھر اس سے اگلے سال ۱۹۹۱ء میں اسی اسلامک سالویشن فرنٹ کی ملکی انتخاب میں بھاری جیت، جو عالم اسلام میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا، اور بہتوں کے لیے ایک چشم کشا امر۔اسلامی سیکٹر کے توانا ہونے پر اس کی دلالت غیر معمولی تھی۔

اسّی نوّے کی دَہائی کے شروع میں سوویت یونین کے دھڑام ہو جانے کے نتیجے میں اور اس کے زیر قبضہ رہنے والی چھ مسلم ریاستوں میں اذان بحال ہو جانے کے بعد، ''اسلامیوں'' کے جذبے اس سے آگے کے کچھ ستاروں پر کمند ڈالنے کے لیے بے چین ہونے لگے۔

نوّے کی دہائی کے وسط تک افغانستان کا یہاں کے کٹر ''بنیاد پرستوں'' کے قبضے میں آجانا، جس کے بعد وہی ''ممولا'' جس کو اَسّی کی دَہائی میں مغربی بلاک کا دست نگر ہونے کے طعنے ملتے تھے، حالیہ صدی کے شروع سالوں میں پوری دنیا کو حیران کرتے ہوئے اُسی مغربی ''شہباز'' سے جا بھڑا تھا اور دو عشروں کی ایک خون آشام جنگ کے بعد آخرِکار اسے افغانستان میں شکستِ فاش سے دوچار کر کے دنیا کو حیران کر گیا۔

''اسلامیوں'' کی اپیل اس کے بعد بھلا کیوں نہ بڑھتی!

یہ تمام واقعے ایک طرف۔اس سے بالکل ہٹ کر ایک دوسری سطح پر ایک اور بڑا واقعہ ہوا۔ اور وہ یہ کہ مغرب کسی ''برین ڈرین'' کے تحت ہمارے عالم اسلام کے ذہین ترین طالبعلموں کو بڑی تعداد میں اپنی یونیورسٹیوں کے اندر پڑھانے سکھانے کا جو عمل چالیس اور پچاس کی دہائیوں سے شروع کر چکا تھا، وہ اب ستّر کی دہائی کے اواخر تک آتے آتے ایک ایسا تناور درخت بن چکا تھا کہ اس ''برین ڈرین'' کا ایک بڑا حصہ یورپ و امریکہ میں ''سیٹل'' ہونے کے بعد اپنی ''نماز روزے'' کی ضرورت کے تحت وہاں جگہ جگہ ''اسلامک سینٹرز'' بنا چکا تھا جو یورپ اور امریکہ کے مادہ پرستی کے بھنبھوڑے ہوئے انسانوں کے لیے اسلام سے

تعارف پانے کا ایک ایسا ذریعہ بنا جو مغرب کے انسان کو شاید تاریخ میں اس بڑی سطح پر کبھی دستیاب نہیں ہوا تھا۔ دنیا یکایک کیا دیکھتی ہے ''گورے'' اور ''گوریاں'' دھڑا دھڑ اسلام قبول کرنے لگے ہیں! اور وہ بھی اس بڑی سطح پر کہ اس سے کسی قدر یورپ و امریکہ کی ڈیموگرافی تبدیل ہونے لگی ہے۔ یہاں تک کہ کئی مغربی ملکوں میں عیسائیت کے بعد ''دوسرا بڑا مذہب'' اب یہودیت نہیں بلکہ اسلام ہو گیا ہے اور ''پہلے بڑے مذہب'' کو اچھا خاصا ٹف ٹائم دینے لگا ہے۔ الناس علی دین ملوکھم۔ ''گوریاں'' (اور وہ بھی بہت پڑھی لکھی ''گوریاں'') اور ''گورے'' جب ''اسلامی شعائر'' پر فخر کرتے دیکھے جائیں تو ہمارے اس ''تھرڈ ورلڈ'' کی نظر بھی اسلام کے متعلق کچھ تو بدلے گی۔ ''حجاب'' جب یورپ اور امریکہ ایسے ''فرسٹ ورلڈ'' پر کامیاب یلغار کرنے لگے تو اپنے احساسِ کمتری میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں کو بھی کچھ تو فرق پڑے گا۔ ''انگریزی'' بولنے والے اسلامی داعی جو اتنی بڑی تعداد میں آ گئے، تو وہ ایک ''انگریزی سے مرعوب'' قوم کو کچھ تو مرعوب کریں گے! یہ نیا فنامنا بھی ستّر کی دہائی تک اچھا خاصا طاقتور ہو چکا تھا اور اس کے بعد سے مسلسل روبہ ترقی ہے۔ چنانچہ یہ بھی ایک ایسی چیز ہوئی جس سے دنیا میں ''اوورآل'' اسلامی پانیوں کی سطح بلند ہوئی تو سبھی اسلامی کشتیاں اوپر اٹھ گئیں۔

اِس صدی کے شروع عشرے میں افغانستان اور پھر عراق میں بیرونی قبضہ کاروں کے خلاف مسلم جوانوں کی مزاحمت، جس نے بہادری اور للّٰہیت کی نئی داستانیں رقم کر دیں۔ ''مسلم سٹریٹ'' کو اتنے بڑے اسلامی وقائع سے کچھ تو اثر لینا تھا۔

دس کے عشرے میں ''عرب بہار'' تیونس، لیبیا، مصر اور شام میں اپنے اسی تسلسل کا کچھ بڑی سطح پر اظہار تھا جو اپنی مختلف صورتوں میں ابھی تک اپنا ظہور کیے جا رہی ہے؛ اور ابھی بھی کہہ نہیں سکتے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

۲۰۲۲ء میں ملائشیا میں ''اسلامی پارٹی'' کا پارلیمنٹ کی سب سے بڑی جماعت بن جانا۔ اور اس سے پہلے بھی اسلامائزیشن کے بہت سے اقدامات۔

اور اب حالیہ برسوں میں بنگلہ دیش اور شام میں اسلام اور اسلامیوں کی پیش رفت۔

﴿وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ﴾ عالم اسلام کی سڑکوں چوراہوں پر ''حجاب'' کا یہ بڑھتا ہوا راج...... اس کے پیچھے کارفرما بہت سی محنتوں اور حقیقتوں کا عکاس ہے۔ دین کے کچھ مشعل بردار جونجانے کیوں آج مایوسیوں کی زبان بولنے لگے ہیں، اگر وہ ''آئیڈیلسٹ'' نہیں، اور معلوم رہے ''آئیڈیلزم'' اسلامی عمل کو لگنے والا ایک مہلک ترین وائرس ہے، تو یہ مایوسیوں کی زبان بالکل بے جا ہے۔ ہمارے رب کی مہربانیاں جو ہم ان عشروں میں بچشمِ سر دیکھ چکے، ہماری توقع سے بڑھ کر رہی ہیں۔

اور کیا بعید آئندہ سالوں اور عشروں میں آپ یک لخت ایسی ایسی پیش رفت دیکھیں جس کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ اللہ پر بھروسہ مومن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں کہ یورپ میں بھوک پڑنا شروع ہوگئی ہے۔ امریکہ کو حریفوں سے نمٹنا روز بروز مشکل ہورہا ہے۔ اس کا امکان بہرحال ہے کہ مغربی بلاک کے بھی کسی دن مشرقی بلاک کی طرح ہاتھ کھڑے ہوجائیں۔ اور وہ دن تصور کرنے کا ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے، ایسے کسی بدلتے سیناریو میں عالم اسلام پر" حجاب" کا کیسا راج ہوسکتا ہے۔

بات پچاس، ساٹھ اور ستر کی دہائیوں کی ایک معمولی سی تصویر سے شروع ہوئی تھی! واقعتاً اُس دور کے بہت سے مناظر اب بڑے ہی اوپرے اور انہونے لگتے ہیں! خاصے یقین سے کہا جاسکتا ہے، دیکھنے والے کی حیرانی آتے برسوں عشروں میں اِس حوالہ سے اور بھی بڑھ سکتی ہے، میرے رب کے حکم سے۔

ابھی تو خاتون نے ''لاہور'' کے ایک ٹانگے کی تصویر شیئر کی ہے۔ اُسی ساٹھ اور ستّر کی دہائیوں کی کوئی ''کابل'' کی تصویر شیئر کی ہوتی اور اس کا ''آج کے کابل'' سے تقابل کیا ہوتا...... تو ہمیں اندازہ ہوتا کہ زمانہ اسلام کی سمت میں بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمۡرِهٖ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ﴾ (21)

عالم اسلام　　　　　پروفیسر ندیم غفور

مسجد اقصیٰ کی تباہی کا خدشہ

صہیونیوں کی عوامی مقبولیت تیزی سے ختم ہو رہی ہے، خاص طور پر نوجوان نسل کے درمیان۔ نیویارک میں زہران ممدانی کی حیران کن مقبولیت دیکھیں (https://www.zohranfornyc.com/)۔ یہ تبدیلی اتنی تیز اور ہمہ گیر ہے کہ مرکزی دھارے کے میڈیا کے مبصرین جیسے پیرز مورگن کو بھی غزہ پر اپنے مؤقف میں تبدیلی لانی پڑ رہی ہے۔ ٹکر کارلسن جیسے افراد اب امریکہ میں اسرائیلی لابی کو کھلے عام چیلنج کر رہے ہیں (https://www.youtube.com/watch?v=HXzejeBP4AY)۔ عوامی رائے میں یہ تبدیلی آسانی سے پلٹائی نہیں جا سکتی۔ صہیونیوں اور ان کے فکری سرپرست عیسائی صہیونیوں کو اب احساس ہو چکا ہے کہ ان کا بیانیہ تیزی سے اپنی بنیادیں کھو رہا ہے۔

اگر وہ اپنے مسیحائی خواب، یعنی ''گریٹر اسرائیل'' اور ''تیسرے ہیکل'' (third temple) کی تعمیر کو پورا کرنا چاہتے ہیں، تو انہیں یہ ابھی کرنا ہوگا ورنہ انہیں دوبارہ موقع شاید جلد نہ ملے۔ ''گریٹر اسرائیل'' کا بیشتر کام حقیقت میں مکمل ہو چکا ہے کیونکہ اس خطے کے تمام حکمران دراصل اسرائیل کے مقرر کردہ یا منظور شدہ گورنر ہی ہیں۔ اگر آپ کو اس پر شک ہے تو بس یہ دیکھیے کہ ایران کی جانب سے اسرائیل پر داغے گئے میزائلوں کو کس نے روکا؟ صرف ''تیسرے ہیکل'' کی تعمیر باقی رہ گئی ہے، اور اس کے لیے وقت ختم ہوتا جا رہا ہے۔

انہوں نے مشرق وسطیٰ اور اس کے آس پاس کے بے شرم سنی/عرب حکمرانوں کا جو اتحاد گزشتہ کئی دہائیوں میں بنایا ہے، وہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ شاید بہت سے لوگ یہ بات بھول چکے ہیں کہ ۲۰۱۹ء میں مسجد اقصیٰ میں آگ لگی تھی کیونکہ دنیا کی توجہ اس وقت نوٹرے ڈیم کیتھیڈرل کی آگ پر مرکوز تھی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ آگ حادثاتی تھی یا جان بوجھ کر لگائی گئی تھی، لیکن ہماری طرف سے اس پر بے حسی نے اسرائیل کو یہ پیغام دے دیا کہ وہ یہ کام دوبارہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا، یہ بہت ممکن ہے کہ اسرائیل آئندہ چھ ماہ سے ایک سال کے دوران مسجد اقصیٰ کو کسی ''حادثاتی'' آگ یا کسی اور طریقے سے گرانے کی کوشش کرے گا لہٰذا جاگتے رہنے کی ضرورت ہے۔

عالم اسلام

ڈاکٹر مسعود ابن نظر

عرضِ مسلم بحضورِ حق

ارضِ بیت القدس ہے کیوں زیرِ پائے کافراں
نوجوان و طفل و زن کیوں مثل خس ہیں فی سعیر

غازئ روشن جبیں و عابدِ شب زندہ دار
کفر کے زنداں میں ہے کیوں آج مجبور و اسیر

زندگی میں جن کی دینِ مصطفیٰ غالب ہوا
ہے نجومِ رشد سے جن کی حکومت مستنیر

جس کی بودوباش سے سماں ’الفقر فخری‘ ہے عیاں
وہ جوانانِ غزہ ہیں آج مغلوب و اسیر

طعنہ زن ہے کفر وہ مولا کہاں پہ کھو گیا
اہلِ ایماں جس کو کہتے تھے کہ ہے نعم النصیر

امتِ خیر الامم اور اس طرح خوار و زبوں
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

جوابِ حق

ہے کہاں امت کہ جس کو سرفرازی ہو عطا
اس کی بد اعمالیاں لے آئی ہیں یومِ نکیر

یہ ہجوم اقوامِ مسلم کا ہے جو امت نہیں
ملتِ کافر کا دیکھو اتحادِ بے نظیر

اس عہد میں کس نے میرے دین کو نافذ کیا؟
ہیں تمہارے دوست جو ہیں اس کے اعدائے شریر

دیکھ اپنے حکمرانوں پر سزاؤں کا نزول
یہ ذلیل و رسوا ہوں گے در قبا ہائے حریر

بھول کر طاقت میری تم ڈر گئے طاغوت سے
جس کو تم سمجھے ہو مولا ہے وہی بئس العشیر

ہے نفاق و سرکشی اقوامِ مسلم کا شِعار
اہلِ ایماں کب حصارِ دیں میں ہوں گے مستجیر؟

بقیہ مغربی تہذیب کے پیدا کردہ چیلنجز

جبکہ ربِّ کریم نے موت سے ہمکنار کرنے کا ایک اور ذریعہ بھی انسان کو دکھا دیا ہے، اس وقت دُنیا بھر کے سات ارب انسان اپنے آپ کو کورونا وائرس سے اور اس کی اگلی لہر سے بچانے میں مصروف اور خوف زدہ ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ بڑا سوال یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا کیا ہوگا؟ کافر اور مومن کی نفسیات میں ایک بنیادی فرق یہی ہے کہ کافر موت سے ڈرتا اور مومن جواب دہی سے، کافر موت کا ذکر نہیں سننا چاہتا اور مومن اپنی موت کو یاد رکھنے کے لیے اس کا روزانہ ذکر کرتا ہے، اس کے لیے کسی بھی جنازے میں شرکت اپنے دل کے زنگ کی صفائی، ایمان کی تجدید اور جواب دہی کی فکر کے احساس کو تازہ کرنے کا ایک اہم موقع ہوتا ہے، اسی لیے جنازوں میں شرکت کی خصوصی تاکید کی گئی ہے اور نمازِ جنازہ کے بعد تدفین کے لیے قبرستان میں موجودگی پر اور بھی زیادہ زور دیا گیا ہے، افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کے مسلمان میں اپنی ایمانی کمزوری کے باعث موت کا خوف طاری ہوگیا ہے اور اس خوف نے زندگی سے تقویٰ اور احساسِ ذمہ داری کو شدید صدمہ پہنچایا ہے۔

تبصرۂ کتب مدیر

کتاب نما

ماہنامہ صفدر لاہور مدیر مسئول: مولانا احسن خدامی

مولانا احسن خدامی اور ان کے بھائی مولانا حمزہ احسانی (ماہنامہ صفدر کے مدیر) دونوں مولانا سرفراز خان صفدر مرحوم کے پوتے ہیں اور بڑی محنت سے اس جریدے کو مرتب کرتے ہیں۔ انہوں نے اس کے بہت سے ضخیم نمبر بھی نکالے ہیں۔ پرچے کی لوح پر ’’اکابر اہل سنت (دیوبند) کے افکار و نظریات کے بے باک ترجمان‘‘ کے الفاظ کندہ ہیں اور اس پر مسلکی رنگ غالب ہے۔

پرچے سے ہماری دلچسپی اور اس کی پسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ یہ پرچہ جاوید احمد غامدی اور اس کے ملحدانہ نظریات خصوصاً اس کے شاگرد عمار خاں ناصر اور اس کے متجددانہ خیالات کی نفی کرتا ہے۔ اس نے پہلے دو جلدوں پر مشتمل غامدی نمبر نکالا اور ملک بھر کے علماء اور دارالافتاء سے غامدی کے بارے میں آراء جمع کیں۔ اسی طرح انہوں نے تازہ شمارہ جلد ۱۳۹ تا ۱۴۷ (ستمبر تا دسمبر ۲۰۲۲ء) بطور اشاعت خاص ’’عمار خاں ناصر اور جاوید احمد غامدی: فتاویٰ و آراء کی روشنی میں‘‘ مرتب کیا ہے اور اس میں بڑی محنت سے ایک سو کے قریب علماء کی آراء عمار ناصر کے بارے میں جمع کی ہیں۔ جاوید احمد غامدی کے بارے میں ۳۴ دارالافتاء کے فتاویٰ جات اور ۵۲ علماء کرام کی آراء بھی اس شمارے کی زینت ہیں۔

ہم بھی ماہنامہ صفدر کی اس محنت سے استفادہ کرتے ہیں اور تازہ البرہان میں بھی اس خصوصی اشاعت سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اگر اگلے کسی شمارے میں عمار ناصر کی متنازعہ تحریریں دے دی جائیں اور ان پر علماء کی رائے سامنے آجائے تو بات مزید کھل کر سامنے آجائے گی۔

اس شمارے (۱۶۰ صفحات) کی خصوصی رعایتی قیمت ۱۵۰ روپے ہے اور یہ جامعہ حنفیہ، امداد ٹاؤن، شیخوپورہ روڈ، فیصل آباد (فون: 0312-4612774) سے مل سکتا ہے۔ ایسے اہم جریدے کی قیمت کم رکھنا بھی ایک مجاہدہ ہے تاکہ مہنگائی کے اس دور میں لوگ آسانی سے اسے خرید سکیں۔

رہنمائے ملت اسلامیہ از میر افسر امان، اسلام آباد

میر افسر امان صاحب نیوی کے ریٹائرڈ افسر ہیں جو جماعت اسلامی سے وابستہ ہیں اور جنہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد شعبۂ صحافت کو اختیار کیا اور اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ پھر ان مضامین کے مجموعے چھاپنے شروع کیے۔ ایسا ہی ایک مجموعہ مضامین 'رہنمائے ملت اسلامیہ' اس وقت ہمارے سامنے ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر خلفاء راشدین، مسلم حکمرانوں، علماء کرام، اہل دانش، مجاہدین، سائنس دانوں پر مختصر مضامین شامل ہیں۔ یہ سادہ زبان میں عام لوگوں کے لیے لکھے گئے مختصر مضامین ہیں جو معلومات میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور دینی جذبات کو انگیختہ بھی کرتے ہیں۔

ہم کتاب کے مرتب اور دوسرے مصنفین اور محققین کی معلومات کے لیے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مغربی ممالک میں یہ ایک عام علمی رویہ ہے کہ کوئی پروفیسر، محقق اور ادیب جب کسی موضوع پر کتاب یا تحقیقی مضمون لکھتا ہے تو اپنے ساتھی ماہرینِ مضمون کو دکھاتا ہے اور بحث وتمحیص کے بعد، اگر ضرورت سمجھے تو اپنے خیالات پر نظر ثانی کر لیتا ہے۔ اسی طرح عموماً ہر کتاب اور رسالے کا ایک لینگویج ایڈیٹر ہوتا ہے جو مصنف کے علاوہ کوئی اور آدمی ہوتا ہے جسے زبان پر دسترس حاصل ہوتی ہے۔ کتاب یا رسالے کے سرورق پر اس لینگویج ایڈیٹر کا نام باقاعدہ چھپا ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس میں نہ شرمندگی کی کوئی بات ہے اور نہ چھپانے کی۔ ان دو اقدامات سے یہ ہوتا ہے کہ کتاب علمی ولسانی غلطیوں سے پاک ہو جاتی ہے۔ اگر احباب ہماری اس بات کی طرف توجہ دیں تو ان کا کام بہتر صورت میں سامنے آ سکتا ہے۔

کتاب کے حصول کے لیے مصنف/ پبلشر سے 0321-3897328 پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

when he realizes that he is neither this nor that-he is only a slave of Allah, and all credit belongs solely to Allah and no one else.

This process is not easy. But when a person discovers his true self-what Iqbal famously described as Khudi-he experiences an inner peace and bliss that no billionaire or worldly celebrity could ever fathom. At this point, the person becomes a Sufi in the truest sense, and only then can he begin to truly understand what the Holy Prophet (SAW) said, did, felt, and thought.

Needless to say, this is far easier said than done. The concept may be grasped intellectually in a few minutes, but to embody it is like climbing a mountain. Still, the reward of this surrender is infinite-and absolutely worth the climb. And yet, if Allah wills, that mountain can be scaled with ease and swiftness. In some rare cases, people are transformed into Sufis without facing any hardship at all. In the end, it is purely a gift from Allah. He is not bound by any rules or procedures. It is entirely His discretion-beyond logic, beyond explanation.

http://www.aadilfarook.com

اطلاع تبدیلیٔ دفاتر

البرہان کے تمام قارئین کو اطلاع دی جاتی ہے کہ ہمارے دفاتر 136 و 178 نیلم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور سے 127 علی ٹاؤن، رائے ونڈ روڈ، لاہور پر منتقل ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ہر طرح کی خط کتابت اور ملاقات مذکورہ پتا پر کی جائے۔

ماہنامہ البرہان و اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ۔ 127 علی ٹاؤن، ڈاکخانہ نیاز بیگ، رائے ونڈ روڈ لاہور۔ پوسٹ کوڈ 53700

a Wali of Allah. Nothing else can peel away the countless layers of contamination This is why people often feel disconnected from Islam, its personalities, and its literature, but deeply moved or instantly connected when watching a movie by Shahrukh Khan. The difference lies in how deeply their *Fitrah* has been buried.

Since very, very few people are blessed with *Hidayah*, *Tawfiq*, or the prayer of a true friend of God, it creates the illusion that this worldly, corrupted mindset is actual human nature-because everyone seems to think and feel the same way. But to conclude that corrupted human behavior is equal to natural human nature is a superficial and shallow interpretation-born from a lack of deep reflection.

Sufism takes this concept to another level altogether. It offers a deeply philosophical understanding of what it means to be a true seeker-a Sufi.

As human beings, we surround ourselves with multiple false identities that make us feel secure, strong, and successful. We take pride in being engineers, doctors, authors, poets, musicians, professors, businessmen, and so on. Yet, according to the Quran, all of these are mere illusions. The only real identity of a human being is that he is nothing but a slave ('abd) of Allah. These false identities nourish, pamper, and reinforce the ego-which itself is an illusion.

In truth, human beings are nothing, and they deserve no credit for anything. But the ego craves fulfillment and seeks validation through social comparison, always trying to prove that we are not inferior to others. As a seeker of Allah begins the spiritual journey, he is gradually stripped of these false identities-one by one-through a long and sometimes painful process of self-purification. Eventually, a moment arrives

Aadil Farook

Human Nature: Islam and the Harsh Realities of the World

The Quran refers to human nature as Fitrah. According to Islam, the natural disposition of man is created by Allah in such a way that accepting and following the truth should come naturally. However, what we witness today is the exact opposite-rejection of the truth appears almost inevitable. Why is that so?

From birth to adulthood, we undergo a process shaped by modern lifestyles. During this journey, we are exposed to countless influences and signals through:

- Family,
- Education systems
- Society
- Television and media
- Movies and music
- Internet and social media
- Books and literature
- Friends, and so on.

All of these sources contaminate, dilute, and distort what the Quran describes as *Fitrah*. By the time we reach adulthood, our innate nature has often been compromised to such an extent that our original, God-given human nature is almost completely masked. This is why secular Western ideologies often resonate with our minds, hearts, and souls, while Islamic or Sufi thought can feel unfamiliar-even alien-as though it goes against human nature.

By the time a person reaches their 30s or 40s, they have become a product of this distortion. At that stage, only one thing can truly restore connection with the truth: Allah's intervention-in the form of *Hidayah* (guidance) and *Tawfiq* (divine enablement)-or the heartfelt prayer or gaze (*nazar*) of